مجلس ادارت

معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ساٹھ روپے　　فی شمارہ پانچ روپے

پاکستان میں سالانہ ایک سو پچاس روپے

دیگر ممالک میں سالانہ　ہوائی ڈاک　پندرہ پونڈ یا چوبیس ڈالر

بحری ڈاک　پانچ پونڈ یا آٹھ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ :۔ حافظ محمد یحیی شیرستان بلڈنگ
بالمقابل ایس ایم کالج ۔ اسٹریچن روڈ ۔ کراچی

• سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں ، بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں :

DARUL MUSANNBFIN SHIBLI ACADEMY AZAMGARH

• رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے ، اگر کسی مہینہ کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہیے ، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

• خط و کتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

• معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
کمیشن ۲۵٪ ہوگا ـــــ رقم پیشگی آنی چاہیے۔

جلد ۱۵۱ ماہ اپریل ۱۹۹۳ء مطابق ماہ شوال ۱۴۱۳ھ عدد ۴

مضامین

مقالات

معارف کی ڈاک

ادبیات

باب التقریظ والانتقاد

شذرات

روسی فوجوں کے انخلا اور نجیب اللہ حکومت کے خاتمہ کے بعد بھی افغانستان میں امن و امان مفقود رہا اور مجاہدین کی کشمکش سے وہاں خون خرابہ جاری رہا۔ اس خانہ جنگی اور برادر کشی کے پس پردہ ان دشمنان اسلام کی سازشیں کارفرما ہیں جو کمیونزم کا شیرازہ بکھرنے کے بعد اسلام کو اپنا سب سے بڑا حریف سمجھ رہے ہیں اس لیے اس کی بیخ کنی کے لیے انھوں نے دنیائے اسلام میں ہلچل مچا رکھی ہے۔ مسلم ممالک میں تصادم پیدا کرکے انھیں اپنا دست نگر بنائے ہوئے ہیں۔ اور بعض کو دہشت پسند اور بنیاد پرست قرار دے کر ساری دنیا سے انھیں الگ تھلگ کر دینا چاہتے ہیں۔ ان کی اس سازش کو کامیاب بنانے میں فراست و دور اندیشی سے مسلمان حکمرانوں کی محرومی کو بھی دخل ہے۔ افغانستان میں مجاہدین کے تصادم، ضد اور ناعاقبت اندیشی سے اس کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ اقوام عالم کے موجودہ ٹھیکیدار اور امن عالم کے نام نہاد علمبردار جن کے دامن خون مسلم سے داغدار ہیں، امن و تصفیہ کے "مبارک کام" کے لیے افغانستان میں اپنی دخل اندازی شروع کر دیں لیکن خدا کا شکر ہے کہ ان کی سازشیں ناکام ہو گئیں۔

مجاہدین کی مختلف تنظیموں کے درمیان اسلام آباد میں ہونے والے سمجھوتے کے بعد جنگ بند ہو گئی ہے۔ افغان لیڈروں نے عمرہ کرکے خانہ کعبہ میں اسلامی ملکوں کے سربراہوں کی موجودگی میں اسلام آباد معاہدہ کی توثیق کی ہے۔ جس پر ہم کو فرزدق کے وہ اشعار یاد آگئے جو اس نے جریر کو مخاطب کرکے کہے تھے

الم ترنی عاهدت ربی واننی   لبین رتاج قائما ومقام

کیا تجھے نہیں معلوم کہ میں نے خانۂ کعبہ کی چوکھٹ اور مقام ابراہیم کے درمیان کھڑے ہو کر اپنے خداوند سے یہ عہد کیا ہے کہ ؎

علی حلفة لا اشتم الدهر مسلما   ولا خارجا من فیّ زور کلام

مدة العمر نہ کسی مسلمان کو گالی دوں گا اور نہ میرے منھ سے کوئی جھوٹی بات نکلے گی۔

اس لیے ہماری یہ امید بیجا نہ ہوگی کہ اب افغانستان میں پائدار امن کا راستہ ہموار ہوگا۔ اور افغانی اپنے اختلافات اور معمولی فائدوں کو نظر انداز کریں گے۔ تاکہ ان کی اور اسلام کی مزید رسوائی اور جگ ہنسائی نہ ہو۔ ہم نے جس طرح مجاہدین کے متحارب گروہوں میں مفاہمت کی خبر سنی ہے اسی طرح اپنے ملک کی تعمیر و ترقی میں ان کے جُٹ جانے کی خبر سننے کے لیے بھی بے چین ہیں۔ ان کے جھگڑے سے ناگواری اور مایوسی ان کو ہوئی ہے جو زبانی تو قوموں کی آزادی و خود مختاری کا دم بھرتے ہیں۔ لیکن ان کی چیرہ دستی اور تفریق ملل کی پالیسی سے ساری دنیا تنگ ہے ؎

یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت   پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیم مساوات

گزشتہ مہینہ بمبئی میں جو زوردار اور تباہ کن دھماکے ہوئے ان میں سیکڑوں جانیں ضائع گئیں اور بہت سارے لوگ زخمی ہوئے۔ کلکتہ اور بعض دوسرے شہروں میں بھی خوفناک دھماکے ہوئے۔ اور ان میں بھی بے گناہ شہریوں کی جان و مال کو نقصان پہونچا۔ ہندوستان کی تاریخ کا سب سے شرمناک اور بدترین واقعہ ۶؍ دسمبر کو اجودھیا میں پیش آیا جس کے بعد ہی سے ملک پر نحوست کی گھٹا منڈلا رہی ہے پہلے قیامت خیز فسادات ہوئے جن کا خاص نشانہ بمبئی کو بنایا گیا تھا۔ ابھی وحشت و درندگی کا یہ مظاہرہ ختم بھی نہیں ہونے پایا تھا کہ وہیں بمباری کے یہ لرزہ خیز واقعات رونما ہوئے جو بڑے افسوسناک، سخت قابل مذمت اور ملک کے اتحاد و سلامتی کے لیے خطرہ ہیں۔ جس ملک کا عقیدہ سیکولرازم، جمہوریت، صلح، رواداری، محبت، بھائی چارگی اور عدم تشدد کے فلسفہ پر ہو۔ اور جس میں جانوروں کی ہتیا کو بھی پاپ سمجھا جاتا ہو وہاں ایسے پرتشدد واقعات اور انسانوں کا قتل عام ہونا کس قدر حیرت ناک ہے۔

اس کی خوشی ہے کہ بم دھماکوں کے بعد ہی وزیر اعظم اور وزیر داخلہ موقع پر پہونچ گئے اور اعلان کیا کہ ہر قیمت پر مجرموں کا پتہ لگانے کی کوشش کی جائے گی۔ وزیر اعظم نے کہا کہ بمبئی کے تباہ کن دھماکوں کے ذمہ داروں کو پکڑنے کا حکومت مصمم ارادہ کر چکی ہے۔ اس کا پہلا کام یہ ہوگا کہ ان طاقتوں کو بے نقاب کرے جن کے دماغوں نے

دوسروں کے ہاتھوں سے یہ حرکت کرائی۔ تحقیقات اب چاہے ملک کے اندر کہیں لے جائے یا ملک کے باہر، حکومت دور تک پیچھا کرنے کا ارادہ کر چکی ہے۔ وزیر اعظم کے اس اعلان کا یہ اثر ہوا کہ حکومت کی مشینری پوری طرح حرکت میں آگئی۔ سی۔ بی۔ آئی نے تفتیش کا کام فوراً شروع کر دیا۔ افسروں کی ایک اعلیٰ سطحی ٹیم بمبئی پہونچ گئی اور فوج بھی تعینات کر دی گئی۔ غرض امکان بھر حکومت نے اس معاملہ میں کوئی کور کسر باقی نہیں رکھی تعجب اس پر ہے کہ بم دھماکوں میں اس قدر مستعدی دکھانے اور ۲۵ر فروری کو دہلی میں ہونے والی بی۔ جے۔ پی کی ریلی کو بالکل ناکام بنا دینے والی حکومت بابری مسجد ڈھائے جانے پر چپ سادھے رہی اور اس کے نتیجے میں ملک بھر میں ہونے والے فسادات کے معاملہ میں اس نے بڑی نااہلی اور کمزوری کا ثبوت دیا۔

مسجد کے تحفظ اور اس کی دوبارہ تعمیر کے سلسلہ میں وزیر اعظم نے جتنی باتیں کہیں وہ سب یاد رہ گئیں، بابری مسجد پر جو وہائٹ پیپر شائع کیا گیا ہے اس کے جس قدر حصے اخبارات میں آئے ہیں ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت اپنی نااہلی اور کوتاہی پر پردہ ڈالنا چاہتی ہے اور واقعہ کے پس پشت جس گہری سازش کے پردہ فاش کرنے اور شرپسندوں کو کیفر کردار تک پہونچانے کا اس نے دعویٰ کیا ہے وہ سراسر کھوکھلا ہے۔ کانگریس نے سورج کنڈ میں فرقہ واریت سے جنگ کرنے کا اعلان بڑے زور شور سے کیا ہے۔ لیکن دور دور تک پتہ نہیں چلتا کہ واقعی اس پر عمل بھی ہوگا۔ بابری مسجد ڈھانے والے علی الاعلان کہہ رہے ہیں کہ انھوں نے قابل فخر کارنامہ انجام دیا ہے لیکن حکومت کی نیت صاف نہیں ہے۔ اس کا معیار دُہرا ہے اس نے بم دھماکوں کا پتہ لگانے کے لیے فوراً اکرمس لی مگر اجودھیا کے مجرموں اور بمبئی کے بلوائیوں کے معاملہ میں صبر طلب ہے۔ چار ماہ گزرنے کے بعد خبر آئی ہے کہ بابری مسجد کے انہدام کی تفتیش کے سلسلہ میں کچھ افراد گرفتار کیے گئے ہیں اور کہیں کہیں چھاپے مارے گئے ہیں۔ لیکن جلد ہی اس کا راز بھی معلوم ہو جائے گا۔ اور اب تو بم دھماکوں کی حقیقت کو ظاہر کرنے والے اشارات بھی ملنے لگے ہیں۔

بعض ناشرین دار المصنفین کی مقبول کتابوں کے ترجمے بلا اجازت شائع کیے جا رہے ہیں۔ ایسے تمام لوگوں سے درخواست ہے کہ وہ دار المصنفین کو قانونی چارہ جوئی کے لیے مجبور نہ کریں۔

مقالات

عہد صحابہؓ کا نظام تعلیم و تعلّم

از مولانا قاضی اطہر مبارکپوری

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد برکۃ الاسلام، عصابۃ الایمان، عسکر القرآن، جند الرحمٰن حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فقہ و تقویٰ اور علوم دینیہ کے حامل و ناشر تھے، جن کے بارے میں صحابہ اور تابعین کا بیان ہے:

کان اصحاب محمد صلی اللہ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ
علیہ وسلم ابرھذہ الامۃ	اس امت میں سب سے زیادہ پاکیزہ
قلوباً، واعمقھا علماً واقلھا	دل، علم میں سب سے زیادہ گہرے
تکلفاً، واحسنھا خلقاً واصدقھا	تکلف میں سب سے کم، اخلاق میں سب
ایماناً، اولئک قوم اختارھم	سے بہتر، ایمان میں سب سے سچے تھے،
اللہ لصحبۃ نبیہ و تبلیغ	ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی صحبت
دینہ۔	اور اپنے دین کی تبلیغ کیلئے منتخب کیا تھا،

درسگاہ نبوت کے ان فضلاء و فارغین میں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علی رضی اللہ عنہم عہد رسالت میں فقہ و فتویٰ کی خدمت انجام دیتے تھے، دیگر صحابہ بھی کتاب و سنت اور فقہ و فتویٰ میں بلند مقام رکھتے تھے اور عہد صحابہ میں انھوں نے دینی علوم کی تعلیم، احادیث کی روایت اور تفقہ فی الدین میں حصہ لیا، جن میں یہ حضرات مشہور

ہیں اور دینی علوم میں مرجع مانے جاتے ہیں، علی بن ابوطالب، عبدالرحمن بن عوف، ابی بن کعب، عبداللہ بن مسعود، ابوموسیٰ اشعری، معاذ بن جبل، عبداللہ بن سلام، ابوذر غفاری، زید بن ثابت، ابوہریرہ، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عمرو بن عاص، ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہم، ان کے علاوہ ام المومنین ام سلمہ، انس بن مالک، ابوسعید خدری، عبداللہ بن زبیر، سعد بن ابی وقاص، سلمان فارسی، جابر بن عبداللہ وغیرہ رضی اللہ عنہم حدیث و فقہ اور دینی علوم کے حامل وناشر تھے۔

ویسے حضرات صحابہ میں ہر فرد اپنی ذات سے مینارۂ رشد وہدایت تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اصحابی کالنجوم بایہم اقتدیتم اہتدیتم اور جو حضرات جس علم میں نمایاں تھے آپؐ نے امت کو ان سے آگاہ کر کے ان سے تحصیل علم کی تاکید فرمائی، آپؐ نے فرمایا میرے بعد ابوبکر اور عمر کی اقتدا کرو، قرآن کی تعلیم ان چار سے حاصل کرو، عبداللہ بن مسعود، سالم مولیٰ ابوحذیفہ، معاذ بن جبل اور ابی بن کعب، جس کو قرآن تازہ بتازہ حاصل کرنا ہو ابن ام عبد (عبداللہ بن مسعود) کی قرأت کے مطابق پڑھے، معاذ بن جبل میری امت میں حلال وحرام کے سب سے بڑے عالم ہیں۔ میری امت میں فرائض کے سب سے بڑے عالم زید بن ثابت ہیں، عبداللہ بن عباس قرآن کے بہترین ترجمان ہیں، ابوموسیٰ اشعری کو آل داؤد کی شہنائی دی گئی ہے، علی قضا کے سب سے بڑے عالم ہیں، ابو درداء عبادت میں سب سے آگے ہیں، ابی بن کعب قرأت میں سب سے آگے ہیں، زمین کے اوپر آسمان کے نیچے ابوذر سب سے زیادہ صادق اللہجہ ہیں، عبیدہ بن جراح اس امت کے امین ہیں۔

حضرت ابوبکرؓ دینی امور ومعاملات میں انصار اور مہاجرین کے اہل علم کو جمع

کر کے مشورہ لیا کرتے تھے، ان میں عمر بن الخطاب، علی بن ابی طالب، عبدالرحمن بن عوف، معاذ بن جبل، ابی بن کعب، زید بن ثابت دینی علوم اور فقہ وفتویٰ میں مرجع تھے، حضرت عمر اصحاب شوریٰ کے علاوہ انصار میں سے معاذ بن جبل، ابی بن کعب، زید بن ثابت سے دینی وانتظامی امور میں مشورہ لیتے تھے، اسی کے ساتھ عبداللہ بن عباس اور دوسرے نوعمر صحابہ کو اپنی مجلس میں بلاتے تھے اور فتویٰ کی خدمت عثمان بن عفان، ابی بن کعب اور زید بن ثابت انجام دیتے تھے، حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں بھی یہی حضرات اس منصب پر فائز رہے، معاذ بن جبل سے ان کی وفات کے وقت پوچھا گیا کہ آپ کے بعد ہم کس سے علم حاصل کریں تو بتایا کہ ابو درداءؓ سلمان فارسیؓ عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن سلام سے، حضرت عمرؓ نے مقام جابیہ میں خطبہ دیا اور کہا کہ جس کو فرائض حاصل کرنا ہو زید بن ثابت کے پاس جائے، جس کو فقہ حاصل کرنا ہو معاذ بن جبل کے پاس جائے اور جس کو مال حاصل کرنا ہو میرے پاس آئے۔

مسور بن مخرمہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کا علم ان چھ حضرات پر منتہی ہوتا ہے، عمر، عثمان، علی، معاذ بن جبل، ابی بن کعب اور زید بن ثابت۔

عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں کہ عمر علم کے دس حصوں میں سے نو حصہ اپنے ساتھ لے گئے، اگر عمر کا علم ایک پلہ پر اور دوسرے لوگوں کا علم دوسرے پلہ پر رکھا جائے تو عمر کے علم کا پلہ جھک جائے گا۔

ابوموسیٰ اشعریؓ کہتے ہیں کہ ہم اصحاب محمدؐ کو جب کسی حدیث کے بارے میں مشکل پیش آئی اور ہم نے حضرت عائشہؓ سے اس کے متعلق سوال کیا تو ان کے پاس علم پایا، نیز ان کا قول ہے کہ میں عبداللہ بن مسعود کی مجلس میں بیٹھا تھا، میرے نزدیک

ان کی ایک مجلس میں بیٹھنا ایک سال کے عمل سے زیادہ قابلِ اطمینان ہے، صحابہؓ کے یہ چند آراء واقوال علمائے صحابہ کے بارے میں ہیں، اب ان کے تلامذہ تابعین کے چند بیانات اپنے اساتذہ کے بارے میں ملاحظہ ہوں۔

مشہور تابعی مسروق بن اجدعؒ کا بیان ہے کہ حضرات صحابہ میں عمرؓ، علیؓ، ابن مسعودؓ، زید بن ثابت، ابی بن کعب، ابوموسیٰ اشعری اصحاب فتویٰ تھے، ان ہی کا قول ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ایک صحابی کو اچھی طرح جانچا تو مجھے معلوم ہوا کہ ان سب کا علم چھ حضرات عمرؓ، علیؓ، عبداللہ بن مسعود، معاذ بن جبل، ابودرداءؓ، زید بن ثابت پر منتہی ہوتا ہے اور ان چھ حضرات کو جانچا تو معلوم ہوا کہ ان سب کا علم دو حضرات علیؓ اور عبداللہ بن مسعود پر منتہی ہوتا ہے۔

امام شعبی کا قول ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس امت کے چھ اہلِ علم تھے، عمر، ابن مسعود، زید بن ثابت، علی، ابی بن کعب، ابوموسیٰ اشعری اور اس امت کے قاضی چار تھے۔ عمر، علی، زید، ابوموسیٰ اشعری۔ مجاہد بن جبیر کہتے ہیں علماء تو اصحابِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، محمد بن سیرین کا قول ہے کہ اہلِ علم کی رائے میں صحابہ میں مناسکِ حج کے سب سے بڑے عالم عثمان بن عفان اور ان کے بعد عبداللہ بن عمر تھے، میمون بن مہران کہتے ہیں کہ میں نے ابن عمر سے بڑا فقیہ اور ابن عباس سے بڑا عالم نہیں دیکھا ہے۔

ان علمائے صحابہ کے فقہی اقوال وآراء اور فتاوے ضخیم اور متوسط جلدوں میں جمع کیے جاسکتے ہیں، چونکہ عہد صحابہ میں باقاعدہ تدوین وتالیف کا رواج نہیں تھا بلکہ بعض صحابہ اور ان کے تلامذہ یادداشت کے طور پر صحیفے اور نسخے لکھ لیتے تھے

اس لیے ان کی روایات اور فتاوے اسوقت مدون نہیں ہوسکے اور بعد میں اس کی باری آئی، چنانچہ خلیفہ مامون کے پڑپوتے ابوبکر محمد بن موسیٰ بن یعقوب نے ابن عباس کے فتاوے بیس۲۰ جلدوں میں جمع کیے تھے، ان کے شاگرد مجاہد اور مولیٰ عکرمہ نے ان سے سنکر نزولِ قرآن اور تفسیر قرآن پر کتاب لکھی تھی اسی طرح علی بن ابوطلحہ ہاشمی نے ابن عباس کی تفسیری روایات کو جمع کیا تھا، عبداللہ بن عمرو بن عاص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے احادیث کا ایک مجموعہ الصادقہ کے نام سے جمع کیا تھا، جس کی روایت ان سے کی گئی، ابوہریرہ، ابن عباسؓ جابر بن عبداللہ، انس بن مالک وغیرہ کے تلامذہ نے انکی روایات کو صحیفوں اور نسخوں کی شکل میں جمع کیا تھا (کتاب علل الحدیث ومعرفۃ الرجال، طبقات ابن سعد، جامع بیان العلم، اعلام الموقعین وغیرہ)

علم سے مراد کتاب وسنت اور فقہ ہے

عہد رسالت اور عہد صحابہ میں کتاب وسنت اور تفقہ فی الدین کی تعلیم دی جاتی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ علم تین ہیں انکے علاوہ زائد ہیں، آیۃ محکمہ، سنت قائمہ، فرائض عادلہ، عبداللہ بن عمر کا قول ہے کہ علم تین ہیں، کتاب ناطق، سنت ماضیہ اور لاادری، عبداللہ بن عباس کہتے ہیں کہ علم کتاب اللہ، سنت رسول اللہ ہے، اس کے بعد جو شخص اپنی رائے سے کوئی بات بیان کرے تو میں نہیں جانتا کہ اس کو اپنی حسنات میں پائے گا یا سیأت میں پائے گا، عبداللہ بن مسعود نے کہا ہے کہ کثرتِ حدیث علم نہیں ہے علم تو خشیت خدا ہے[1]

دوسرے علوم اور زبانیں

حضرات صحابہ علم یعنی کتاب وسنت اور فقہ کے ترجمان ومعلم تھے، اسی کے ساتھ دوسرے علوم والسنہ کے عالم بھی تھے، مثلاً علم الانساب میں ابوبکر صدیقؓ،

[1] جامع بیان العلم ج ۲ ص ۲۳ تا ص ۲۶ ملخص۔

ابوالجہم بن حذیفہ، جبیر بن مطعم سب سے بڑے عالم تھے اور جمیع انساب عرب میں رسوخ رکھتے تھے، ان کے علاوہ عثمان بن عفان، علی بن ابی طالب، عقیل بن ابوطالب بھی علم الانساب میں نمایاں مقام رکھتے تھے[1]، حضرت ابوبکر تعبیر رویا میں سب سے آگے تھے، زید بن ثابت سریانی زبان کے عالم تھے، انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے سترہ دن میں اس زبان میں مہارت حاصل کر لی تھی، جیساکہ صحیح بخاری میں ہے، عبداللہ بن عمرو بن عاص بھی سریانی اور عبرانی زبان کے عالم تھے اور تورات پڑھتے تھے، ابوہریرہ نے تورات کو پڑھا نہیں تھا مگر اس کے مضامین سے اچھی طرح واقف تھے، اس کی شہادت کعب احبار نے دی ہے، نیز ابوہریرہ فارسی زبان سے واقف تھے اور بعض روایات کے مطابق حبشی زبان بھی جانتے تھے، ان کے وطن نجران یمن میں اہل فارس آباد تھے جن کو ابناء کہتے ہیں، نیز حبشہ بھی یمن کے سامنے واقع ہے اور وہاں کے لوگ ملک عرب میں کثرت سے رہتے تھے، سلمان کی مادری زبان فارسی تھی، ایک روایت کے مطابق ایرانیوں نے ان سے سورۂ فاتحہ فارسی میں لکھنے کی خواہش کی تو بسم اللہ الرحمن الرحیم کا ترجمہ "بنام یزداں بخشایندہ" لکھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا، ایرانیوں نے اس ترجمہ کو پڑھنا شروع کیا اور جب ان کی زبان نرم ہو گئی تو عربی میں پڑھنے لگے ہیں[2]

مدینہ منورہ کی دینی و علمی مرکزیت

وارثین علم نبوت میں بہت سے حضرات عہد نبوی اور عہد خلافت میں جہاد و غزوات میں شہید ہو گئے، کتنے حضرات بلاد اسلامیہ میں امارت، قضا اور تعلیم کے لیے روانہ کیے گئے، کچھ اپنے اپنے قبائل اور علاقے میں چلے گئے

[1] جمہرۃ انساب العرب ص۵ [2] مناہل العرفان فی علوم القرآن ج ۲ ص ۵۵۔

اور ایک بڑا طبقہ دینی علوم کی تدریس و تعلیم سے پہلے دنیا سے رخصت ہو گیا، اس دور میں جو حضرات مدینہ منورہ میں رہ گئے وہ خلاصۃ الخلاصہ تھے اور شہر نبوت عالم اسلام کا دینی و علمی مرکز تھا، امام مالکؒ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلاں فلاں غزوات سے اتنے اتنے ہزار صحابہ کو لے کر واپس ہوئے، ان میں سے تقریباً دس ہزار مدینہ میں رہ کر یہیں فوت ہوئے، زید بن ثابت کا قول ہے کہ جب تم اہل مدینہ کو کسی مسئلہ پر متفق دیکھو تو سمجھ لو کہ وہ سنت ہے، عبداللہ بن مسعود کو حضرت عمرؓ نے تعلیم کے لیے کوفہ بھیجا تھا، جب وہاں کوئی شخص مسئلہ معلوم کرتا تو جواب دیدیتے تھے، اور جب مدینہ آکر دیکھتے کہ یہاں کے علماء کا عمل اس کے خلاف ہے تو کوفہ واپس جاکر گھر جانے سے پہلے اس شخص کو بتا دیتے تھے کہ اس مسئلہ میں اہل مدینہ کا یہ عمل ہے، ایک شخص نے ابوبکر بن عمرو بن حزم سے کہا کہ فلاں مسئلہ میں مجھ کو خلجان ہے انھوں نے کہا کہ بھتیجے! جب تم اہل مدینہ کو کسی بات پر متفق دیکھو تو تمہارے دل میں اس کے بارے میں خلجان نہیں ہونا چاہیے، مجاہد، عمرو بن دینار اور دوسرے علمائے مکہ کہتے تھے کہ ہم علم میں ایک دوسرے کے مشابہ ہیں، البتہ عطاء بن ابی رباح کو ہم پر اس لیے فضیلت ہے کہ وہ مدینہ سے علم حاصل کر کے آئے ہیں[1]۔

ابوالعالیہ ریاحی بصری کہتے ہیں کہ ہم لوگ بصرہ میں صحابہ سے حدیث سنتے تھے، اس کے بعد مدینہ جاکر وہاں کے صحابہ سے سنکر مطمئن ہوتے تھے، شعبی نے کوفہ میں ایک حدیث بیان کر کے اپنے شاگردوں سے کہا کہ تم لوگوں کو یہ حدیث مفت مل گئی، اس سے کم حدیث کے لیے آدمی سواری کر کے مدینہ جاتا تھا، ابوقلابہ کہتے

[1] ترتیب المدارک، ج ۱ ص ۹۲ و ۹۳۔

ہیں کہ میں نے مدینہ میں کئی دن قیام کیا، حالانکہ اس کے علاوہ میری کوئی حاجت نہیں تھی کہ ایک شخص کے پاس ایک حدیث تھی میں اس کو سنوں، یحییٰ بن ابو کثیر نے مدینہ کا سفر کیا تاکہ صحابہ کی اولاد سے علم حاصل کریں[1]

عمر بن عبدالعزیز نے بلادِ اسلامیہ میں احادیث و سنن کو مدون و مرتب کرنے کے لیے فرمان جاری کیا تو خاص طور سے قاضی مدینہ ابوبکر بن حزم کو لکھا کہ وہاں کی احادیث خصوصاً عمرہ بنت عبدالرحمٰن کی مرویات کو مدون کریں، الغرض مدینہ کے دینی و علمی مرکز سے پورا عالمِ اسلام وابستہ تھا اور اسی مینارۂ نور سے ہر طرف روشنی پھیلتی تھی۔

مدینہ کے چار فقہائے صحابہ اور انکی فقہ کے مراکز

امام ابن قیم لکھتے ہیں:

عربی	اردو
والدین والفقه والعلم	دینی فقہ اور علم حضرت عبداللہ بن مسعود
انتشر فی الامة عن اصحاب	حضرت زید بن ثابت، حضرت عبداللہ
عبدالله ابن مسعود واصحاب	بن عمر اور حضرت عبداللہ بن عباس
زید بن ثابت، واصحاب	رضی اللہ عنہم کے اصحاب و تلامذہ سے
عبدالله ابن عمر، واصحاب	پھیلا ہے اور لوگوں کا عام علم ان ہی
عبدالله بن عباس؛ فعلم	چاروں حضرات کے شاگردوں سے
الناس عامته عن اصحاب	ہے، اہلِ مدینہ کا علم زید بن ثابت
هؤلاء الاربعة، فاما	اور عبداللہ بن عمر کے شاگردوں سے،
اهل المدینة فعلمهم	اہلِ مکہ کا علم حضرت عبداللہ بن عباس

[1] الکفایہ ص ۴۰۲ جامع بیان العلم ج ۱ ص ۹۳، المحدث الفاصل ص ۲۲۳۔

عربی	اردو
عن اصحاب زید بن ثابت	کے تلامذہ سے، اور اہلِ عراق کا علم
وعبدالله بن عمر، واما اهل	حضرت عبداللہ بن مسعود کے اصحاب
مکة فعلمهم عن اصحاب عبدالله	سے ہے۔
بن عباس، واما اهل العراق	
فعلمهم عن اصحاب عبدالله	
بن مسعود[1]	

اور امام بخاریؒ کے استاد امام علی مدینیؒ کا بیان ہے:

عربی	اردو
لم یکن من اصحاب رسول الله	حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت
صلی الله علیه وسلم من له	زید بن ثابت، حضرت عبداللہ بن عباس
اصحاب یذهبون مذهبه	کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
ویفتون فتواه ویسلکون	کے صحابہ میں کوئی عالم ایسا نہیں تھا
طریقته الا ثلاثة، عبدالله	جس کے تلامذہ و اصحاب اس کے
ابن مسعود، وزید بن ثابت	فقہی مذہب پر عمل کرتے ہیں اس کے
وعبدالله ابن عباس[2]	فتوی کے مطابق فتوی دیتے ہیں اور
	اس کے طریقہ پر چلتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ ان چار یا تین حضرات کا فقہی مسلک بنیادی طور پر امت میں رائج ہوا اور فقہ و فتوی میں ان کے اصول پر عمل کیا گیا، ان کے مقابلہ میں دوسرے صحابہ کے فقہی آراء و اقوال کم رائج ہوئے، ان تصریحات میں صحابہ کے تفقہ فی الدین کا ذکر ہے؛

[1] اعلام الموقعین ج ۱ ص ۱۷ [2] کتاب علل الحدیث و معرفۃ الرجال ص ۴۳

تفسیر و تاویل، تحدیث و روایت اور دوسرے دینی امور میں ان کے رسوخ فی العلم سے بحث نہیں ہے۔

مسجد نبوی کی تعلیمی مرکزیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں مسجد نبوی مرکزی درسگاہ تھی، صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے ادوار میں بھی مسجدوں میں تعلیمی مجالس اور حلقے قائم ہوتے تھے بلکہ اعیان واشراف اور اہل علم کی عام نشست مسجدوں میں ہوتی تھی، ابوادریس خولانی کہتے ہیں المساجد مجالس الکرام، حضرت عبد اللہ بن عباس سے ایک شخص نے جہاد میں شرکت کے بارے میں مشورہ کیا تو انھوں نے کہا کہ کیا میں تم کو اس سے افضل عمل نہ بتاؤں ؟ مسجد بناؤ اور اس میں فرائض، سنت اور تفقہ فی الدین کی تعلیم دو[1]، دور صحابہ میں مسجد نبوی میں تعلیمی حلقوں میں تدریسی مجلسوں کی کثرت کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ عبد اللہ بن مسعود کے ایک شاگرد مسجد نبوی میں گئے اور چاروں طرف نظر دوڑا کر کہا کہ

عهدی بعهذا المسجد وانه	اس مسجد میں میرا وہ دور گذرا ہے
کشن الروضة اختر منها	جس میں وہ باغیچہ کے مانند تھی، تم اسکے
حيث شئت[2]	جس درخت کے سایہ میں چاہو بیٹھ جاؤ۔

ابوالاحوص کہتے ہیں کہ ہم نے اہل علم کو دیکھا ہے کہ ان کی مجلسیں صرف مسجدوں میں منعقد ہوتی تھیں[3]، حضرت عمر بن عبد العزیز نے علماء کو حکم دیا تھا کہ علم کی نشر و اشاعت اپنی مسجدوں میں کریں، سنت مٹ رہی ہے۔

---

[1] جامع بیان العلم ج ۱ ص ۲۱ و ص ۳۲ [2] المحدث الفاصل ص ۱۸۰ [3] الفقیہ والمتفقہ ج ۲ ص ۱۲۹

عہد فاروقی میں مسجد نبوی میں تعلیمی حلقوں کی کثرت خلافت راشدہ میں قرآن کی حفاظت و اہمیت کے پیش نظر احادیث کی کثرت روایت سے روکا جاتا تھا، اس کے باوجود مسجد نبوی میں فقہ و فتویٰ اور روایت حدیث کے متعدد حلقے قائم تھے، جن میں دور دراز کے طلبہ شریک ہوتے تھے، حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ان کی کثرت کا اندازہ حضرت ابی بن کعب متوفی ۲۲ھ کے ایک صحابی شاگرد کے بیان سے ہوتا ہے، جندب بن عبد اللہ بن سفیان بجلیؓ بیان کرتے ہیں :

اتيت المدينة، ابتغاء العلم	میں طلب علم میں مدینہ آیا اور مسجد نبوی
فدخلت مسجد رسول الله	میں داخل ہوا تو دیکھا کہ لوگ حلقہ در
صلى الله عليه وسلم فاذا	حلقہ آپس میں حدیث بیان کر رہے
الناس فيه حلق يتحدثون	ہیں، میں ان حلقوں سے گذرتا ہوا
فجعلت امضى الحلق حتى اتيت	ایک حلقہ میں گیا جس میں ایک صاحب
حلقة فيها رجل شاحب	(ابی بن کعبؓ) متفکر بیٹھے ہیں، انکے
عليه ثوبان كانما قدم من	جسم پر دو کپڑے ہیں گویا ابھی سفر سے
سفر۔	واپس آئے ہیں۔

حضرت ابی بن کعب کے مزاج میں کچھ تندی و تیزی تھی، بعض اوقات طلبہ سے بے اعتنائی برتتے تھے، ایک مرتبہ ان ہی جندب بن عبد اللہ بجلیؓ نے ان کی بے رخی پر کہا:

اللهم نشكوهم اليك، انا	اے اللہ! ہم تیری جناب میں ان
ننفق انفاقنا، و ننصب	حضرات کا شکوہ کر رہے ہیں، ہم
ابداننا، ونرحل مطايانا	طلب علم کے لیے اپنے اموال خرچ کرتے

ابتغاء العلم فاذا لقینا ھم	ہیں، اپنے جسموں کو تھکاتے ہیں،
تجھموالنا وقالوا النا[1]	سواریوں پر آتے ہیں اور جب
	ان حضرات سے ملتے ہیں تو یہ ہمارے
	سامنے منھ بگاڑتے ہیں اور نا ملائم
	باتیں کرتے ہیں۔

حضرت ابی بن کعبؓ کے دوسرے شاگرد عتیؒ بن ضمرہ تمیمی بصریؒ کہتے ہیں:

قلت لابی بن کعب نا تیکم	میں نے ابی بن کعب سے کہا کہ ہم لوگ
من البعد نرجو عند کم	دور دراز مقامات سے آپ حضرات
الخیران تعلمونا فاذا	کے یہاں اس امید پر آتے ہیں کہ آپ
اتیناکم استخففتم امرنا	لوگ ہم کو حدیث کی تعلیم دیں گے اور
کانا نھون علیکم[2]	جب آپ کے پاس آتے ہیں تو ہم کو
	حقیر سمجھتے ہیں، گویا آپ کے نزدیک
	ہماری کوئی حیثیت نہیں ہے۔

حضرت ابی بن کعب نے اپنے دونوں شاگردوں کا شکوہ سنکر ان کے ساتھ نہایت محبت وشفقت کا معاملہ کیا اور آنے والے جمعہ کے دن حدیث بیان کرنے کا وعدہ فرمایا مگر اس سے پہلے انتقال کر گئے۔

ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد فاروقی ہی میں مسجد نبوی میں تعلیم وتدریس کے متعدد حلقے قائم تھے اور مدینہ کے باہر کے طلبہ صحابہ کی مجلسوں میں شریک ہوتے تھے،

---

[1] ابن سعد ج ۳ ص ۵۰۰ و ص ۵۰۱ [2] ایضاً ص ۵۰۰۔

تعلیمی مجلسوں میں نوجوان طلبہ کی کثرت

صحابہ کی تعلیمی مجلسوں میں شریک ہونے والوں میں نوخیز اور نوجوان طلبہ کی کثرت ہوتی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں پیشین گوئی فرماکر ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنے اور دین کی تعلیم دینے کی تاکید فرمائی تھی ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ آپ نے صحابہ سے فرمایا تھا:

سیاتیکم شباب من اقطار	عنقریب تمھارے پاس اطراف زمین
الارض یطلبون الحدیث	سے نوجوان علم کی طلب میں آئیں گے
اذا جآؤکم فاستوصوا	جب وہ آئیں تو تم لوگ ان کے ساتھ
بھم خیراً	اچھا سلوک کرنا۔

اور عبد اللہ بن مبارک کہتے ہیں:

اخبرنا ان رسول اللہ صلی اللہ	ہم کو خبر ملی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم قال لایزال اللہ	علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس
یغرس فی ھذا الدین غرسا	دین میں پودے اگاتا رہے گا جن سے
یشد الدین بھم۔	اس دین کو تقویت دے گا۔

حضرت عمرو بن عاصؓ اہل قریش کے ایک حلقہ کے پاس گئے اور کہا کہ تم لوگوں نے ان لڑکوں کو کیوں نظر انداز کر رکھا ہے؟ ایسا نہ کرو، ان کے لیے مجلس میں وسعت پیدا کرو، ان کو حدیث سناؤ اور سمجھاؤ، یہ صغار قوم ہیں، عنقریب کبار قوم ہو جائیں گے، تم لوگ بھی صغار قوم تھے اور آج کبار قوم ہو گئے ہو[1] حضرت حسن بن علیؓ اپنے لڑکوں اور بھتیجوں سے کہتے تھے کہ تم لوگ علم حاصل کرو، اگر آج تم صغار قوم ہو تو کل کبار قوم

---

[1] شرف اصحاب الحدیث ص ۲۱ و ص ۶۵۔

بن جاؤگے، تم میں سے جو یاد نہ کرسکے وہ لکھ لیا کرے۔[1]

حضرت ابوسعید خدریؓ جب اپنی مجلس میں نوجوانوں کو آتے ہوئے دیکھتے تو نہایت والہانہ انداز میں ان کا استقبال کرتے تھے اور کہتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت کو مرحبا ہو، آپ نے ہم سے فرمایا تھا کہ میرے بعد لوگ تمہارے پاس حدیث کی طلب میں آئیں گے، تم ان کے ساتھ لطف وکرم کا معاملہ کرنا، ان کو حدیث کی تعلیم دینا، حسن سلوک سے پیش آنا، مجلس میں جگہ بنانا، اس کے بعد ان سے کہتے تھے کہ:

فانکم خلوفنا واھل الحدیث بعدنا[2]	تم لوگ ہمارے بعد ہمارے جانشین اور حدیث کے عالم ہوگے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جب نوجوانوں کو طلب علم میں دیکھتے تھے تو کہتے تھے،

مرحبا بینابیع الحکمۃ، و مصابیح الظلم خلقان الثیاب جدد القلوب حبس البیوت ریحان کل قبیلۃ[3]	مرحبا حکمت کے سرچشمے، ظلمتوں کے چراغ، پرانے کپڑے، نئے دل والے گھروں کی زینت اور خاندان وقبیلہ کے گل بوٹے۔

درسگاہ صحابہ کے یہ نوجوان طلبہ آگے چل کر علوم نبوت کے وارث ومعلم ہوئے اور ان کا شمار طبقۂ تابعین کے علمائے کبار میں ہوا۔

صحابہ کا اپنے شاگردوں سے محبت اور ان کے ساتھ حسن سلوک

وصیت نبوی کے مطابق حضرات صحابہ نے اپنے حلقہ نشینوں اور شاگردوں کے ساتھ انتہائی شفقت ومحبت اور ایثار وخلوص کا معاملہ کیا ان کی دلداری ودلجوئی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی،

[1] جامع بیان العلم ج ۱ ص ۸۲ [2] شرف اصحاب الحدیث ص ۲۱ [3] جامع بیان العلم ج ۲ ص ۵۲ وص ۵۳

حضرت انسؓ کے شاگرد حمید کا بیان ہے کہ ہمارے ساتھ ثابت بن اسلم بنانی بھی حضرت انسؓ کی مجلس میں جاتے تھے، راستہ میں جو مسجد آتی ثابت اس میں جاکر نماز پڑھتے، جب ہم لوگ حضرت انسؓ کے پاس پہنچ جاتے تو کہتے۔

این ثابت، ان ثابتا دویبۃ احبھا۔	ثابت کہاں رہ گیا؟ ثابت ایسا کیڑا ہے جس کو میں محبوب رکھتا ہوں۔

خود ثابت کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ ہم لوگ حضرت انسؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ہم کو دیکھ کر کہا کہ:

واللہ لانتم احب الی من عدتکم من ولد انس الا من علی مثل ما انتم علیہ[1]	خدا کی قسم میں تم لوگوں کے برابر انسؓ کی (اپنی) اولاد سے زیادہ تم لوگوں کو محبوب رکھتا ہوں البتہ ان میں سے جو تم لوگوں کے مانند ہو۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے پوچھا گیا کہ آپ کے نزدیک سب سے محترم کون آدمی ہے؟ تو بتایا کہ میرا وہ ہم نشین جو حاضرین مجلس کو پھاندتا ہوا میرے پاس آکر بیٹھ جاتا ہے، اگر میرے بس میں ہو تو اس کے چہرے پر مکھی بھی نہ بیٹھنے دوں، اس کے بدن پر مکھی بیٹھتی ہے تو مجھے تکلیف ہوتی ہے[2]، ان کا قول ہے کہ میرے ہم نشین کا میرے اوپر تین حق ہے، اسکو آتا ہوا دیکھوں تو انتظار کی نظر سے دیکھوں، جب بیٹھ جائے تو اسکے لیے گنجائش نکالوں اور جب بات کرے تو غور سے سنوں۔[3]

[1] طبقات ابن سعد ج ۷ ص ۲۳۲ [2] الفقیہ والمتفقہ ج ۲ ص ۱۱۲ [3] الکامل مبرد ج ۱ ص ۱۰۲۔

ابوالعالیہ ریاحی نے غلامی کی حالت میں قرآن پڑھا اور لکھنا پڑھنا سیکھا، وہ کہتے ہیں کہ ابن عباس مجھے اپنے تخت پر بٹھاتے تھے حالانکہ قریش کے اعیان واشراف نیچے بیٹھتے تھے اور کہتے تھے کہ یوں ہی علم عزت و شرافت بڑھاتا ہے اور عالم کو بادشاہوں کی طرح تخت پر بٹھاتا ہے[1]

ابوجمرہ نصر بن عمران ضبعی بصری کہتے ہیں کہ ابن عباس اپنی مجلس میں مجھے تخت پر بٹھاتے تھے اور کہتے تھے کہ تم میرے یہاں رہو، میں تمھارے لیے اپنے مال سے ایک حصہ مقرر کر دیتا ہوں[2]۔

زر بن حبیش کا بیان ہے کہ میں حضرت صفوان بن عسال کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھوں نے پوچھا کہ کس کام سے آئے ہو؟ میں نے کہا کہ طلب علم کے لیے حاضر ہوا ہوں، یہ سنکر انھوں نے خوشی کا اظہار کیا اور مجھے بشارت دیکر کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ طالب علم کے لیے ملائکہ اس خوشی پر اپنے پر بچھاتے ہیں کہ وہ علم طلب کر رہا ہے۔

مدینہ سے ایک طالب علم حضرت ابودرداءؓ کے پاس دمشق گیا انھوں نے اس سے پوچھا یہاں کس لیے آئے ہو، کوئی حاجت ہے یا تجارت مقصد ہے، یا یہ سفر طلب علم کی غرض سے کیا ہے؟ اس طالب علم نے کہا کہ میں صرف طلب علم کے لیے آپ کے پاس آیا ہوں، اس پر حضرت ابودرداءؓ نے مسرت و بشارت کے انداز میں کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو بندہ طلب علم میں نکلتا ہے، فرشتے اس کے لیے پر بچھاتے ہیں، وہ جنت کا راستہ طے کرتا ہے، اور عالم کے لیے آسمان اور زمین والے حتیٰ کہ سمندر کی مچھلیاں استغفار کرتی ہیں اور عالم کی فضیلت زاہد پر ایسی ہے جیسی چودھویں رات کے چاند کی فضیلت تمام ستاروں پر ہے، علماء انبیاء کے وارث ہیں اور انبیاء درہم و دینار وراثت میں نہیں چھوڑتے ہیں بلکہ وہ علم کی وراثت چھوڑتے ہیں جس شخص نے علم کی وراثت حاصل کی اس نے وافر حصہ حاصل کیا[3]

(باقی)

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۵۸ [2] الفقیہ والمتفقہ ج ۲ ص ۱۱۲ و ص ۱۱۰ [3] جامع بیان العلم ج ۱ ص ۳۲ و ص ۳۴

ملّا محمد صوفی مازندرانی

از ڈاکٹر نورالسعید اختر، بمبئی

(۲)

رباعی:-

(۱) پیوستہ اسیر، گردش دورانم ۔۔۔ ہموارہ قرین، فرقت یارانم

بی اصحابم، چون شب مہتابم ۔۔۔ بی یارانم چو کشت بی بارانم[44]

(۲) جانِ من خصم گشت و دل بدخواہ ۔۔۔ دوست دشمن شدست و یار اغیار

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صوفی کو زیرِ آسمان کہیں بھی سکون میسر نہیں ہوا۔ نقطوی مسلک کی بنا پر غالباً انہیں وطن چھوڑنا پڑا۔ چنانچہ کہتے ہیں:

از خاکِ فارس روی رہِ رفتنم نماند ۔۔۔ پا بی مرا زمانہ بدست جفا کشید[45]

صوفی کے اشعار اس امر کی دلیل پیش کرتے ہیں کہ وہ شراب معرفت اور شراب ناب دونوں کے شیدا تھے۔ ان موضوعات پر صوفی کی مرصع غزلیں دستیاب ہوتی ہیں۔ دیوان صوفی کی کئی غزلوں کے پس پردہ ان حقائق کی پردہ کشائی موجود ہے۔ ممکن ہے انہیں "رموزِ عشق و مستی" کا درس اپنے استاد میر سید جلال رضائی بخاری سے ملا ہو۔ اس حقیقت کی طرف صوفی کا واضح اشارہ ملاحظہ کیجیے:

ندانم خبر رموز عشق و مستی ۔۔۔ کہ از استاد خود این یاد دارم[49]

ڈاکٹر محمد صدیق[90] نے صوفی کی شخصیت اور ذاتی زندگی سے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے تحریر کیا ہے[91] کہ:

"In this Poem the Poet also gives an expression of his Personal feelings which are of great value for the study of his Personality. The lines indicate that he led a secluded care free saintly life"

لباس عیش من بے تار و پود است — درخت بخت من بی برگ و بار است

چو من با فقر و فاقہ خو گرفتم — مرا با مردم دنیا چہ کار است

سبکساری گزیدم در رہ عشق — کہ رہ بر گنبد نیلی حصار است

نخواہم بار دیگر بر دل خویش — کہ بر من زندگانی نیز بار است

سبکسارم، از آن خوش می کنم سیر — منم آہو و گیتی مرغزار است

از آنم ملک درویشی خوش آمد — کہ ملک بی نزاع و پای دار است

نہ دروی محنتی از ازدحام است — نہ بادی کلفتی از گیر و دار است[92]

"ساقی نامہ" میں صوفی اپنی بے کیف و بے رنگ زندگی کی تصویر ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں ؎

(۱) بسی گرد گیتی بگشتم بسی — جگر خون تر از خود ندیدم کسی[93]

(۲) ہمہ نام نیکو بتنگ آمدم — ازین زندگانی بتنگ آمدم

(۳) درین بزمگہ باتی چون نیم — نفس میزنم، لیک زندہ نیم

(۴) چو من رخت بیرون برم زین جہان — خروشان بدانسانکہ تیر از کمان

(۵) بنالم چنان زار ازین دار غم — کہ بیرون نیاید کسی از عدم

اپنی ناقدری کا شکوہ درج ذیل اشعار میں تعلّی آمیز انداز میں کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

(۱) بود نسبت من بگوی مغان — ہمان نسبت پیل ہندوستان[94]

(۲) مراگرچہ طبعی است گیتی فروز — در ایران زمین چون چراغم بروز

(۳) ندارم بہر بوم و بر نیستی — نیرزم بیک نان بی منتی

(۴) حقیرم بہر کوی و ہر انجمن — چو فضل اندر ایران و دُر در عدن

(۵) ندارد بمن ز غبتی ہیچکس — در ایران چنانم کہ در دیدہ خس

صوفی کی رندی و مستی کوئی پوشیدہ بات نہیں تھی وہ علانیہ طور پر کہتے ہیں ؎

(۱) رفتم بطرف میکدہ با لبسازم آرزوست — دیوان حافظ نعمہ شیرازم آرزوست[95]

(۲) شب شنبہ شراب باید خورد — می چون آفتاب باید خورد

(۳) باجام مے محمد رود زی قرین شود — کین چرخ را چو شیشہ رسن درگلو کنند

صوفی کے یہاں صوفیانہ پیرایۂ بیان کس حد تک بے باک اور بے لگام ہے۔ انھوں نے ایک صوفی صافی کی حیثیت سے جا بجا محمد تخلص استعمال کیا ہے جو بسا اوقات دو معنی ہو جاتا ہے، صوفی اسی انداز بیان کو عشق حقیقی کی معراج تصور کرتے ہیں۔ چنانچہ "ساقی نامہ" میں کہتے ہیں ؎

(۱) می عشق را در ہم آمیختند — وجود محمد از آن ریختند

(۲) محمد منم این خرد تاج من — فتوحات مکی است معراج من[96]

رباعی: (۱) درظلمت اگر نور وضیا خواہد بود　　معنی در لفظ دلکشا خواہد بود

آن آب کہ عمر جاوداں می بخشد　　قرآں و حدیث مصطفیٰ خواہد بود[95]

صوفی اپنی تر دامنی کے باوجود اپنے زہد و تقویٰ کا اظہار ذیل کے اشعار میں انوکھے پیرایہ میں کرتے ہیں:

(۱) ہاں ای زمین بدیدہ نگاہدار ہمچو اشک　　کز آبروی بندہ ملائک وضو کنند[96]

(۲) عہدے کہ داشت دختر رز با من آن تمانند[97]　　باید کہ محرمان رہی ترک او کنند

(۳) اگر داری پیای سوی ایمان　　محمد را پیمبر میتوان کرد

صوفی نے ہندوستان کو مجازی ہی سہی لیکن اپنا وطن تسلیم کر لیا تھا۔ تاہم انہیں ایران کی بہاریں، شیراز کی مئے گلگوں، احباب و اقارب یاد آجاتے تھے۔ وہ جب بھی دلبرداشتہ ہوتے تو سرزمین ہندوستان انہیں "چاہ یوسف" نظر آتی۔ انہیں جینے اور مرنے تک کا احساس نہ ہوتا۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

(۱) کو فتادم بعالمی کہ درو　　مردن و زیستن است یکسانم[99]

(۲) درزمین سیاہ ہند امروز　　ہمچو یوسف بچاہ کنعانم

(۳) محمد را بکام دشمنان کرد　　فلک در ملک ہندوستان

حتیٰ کہ ہندوستان کے شب و روز صوفی کے لیے قفس سے بدتر ثابت ہوئے اور ایران لوٹ جانے کا خیال ان کے سینے میں انگڑائیاں لیتا رہا چنانچہ کہتے ہیں ؎

(۱) بر من شدہ ست کشور ہندوستان قفس　　یک رہ بملک ایران پروازم آرزوست[100]

رباعی:-
در ہند بسی بوالعجبی در کار است　　حیوان در دوی عزیز و مردم خوار است

از بسکہ بتلخی گذرد اینجا عمر　　مردن آسان و زندگی دشوار است

در ہند بسی کہ رای رایان دیدم　　در صورت بندگان خدایان دیدم

در کسوت مرد دیدہ ام زن بسیار　　با طبل و علم بسی گدایان دیدم

صوفی مزاجاً نہایت سنجیدہ اور متین تھے۔ انہیں شوخی اور مزاح سے عار تھا۔ تاہم ان کے زیر نظر قول کے برخلاف ان کے کلام میں طنز و مزاح کے نشتر پائے جاتے ہیں۔ صوفی کا قول ملاحظہ کیجیے:

(۱) گریزانم از مشت ہزل پیشہ　　مرا از صحبت ہزال عار است[101]

رباعی: (۱) ہر چند وجود را بہم بیختہ اند　　مانند تو پیکری نیا نگیختہ اند

کافور ہمانا بہ یخ آمیختہ اند　　این قالب بیہودہ انسان ریختہ اند

(۲) ای بور خلیل تا تو گشتی شوہر　　یک زن نکند آرزوی شوی دگر

دایم بہ پسر دہند مردم دختر　　این خواجۂ ما دادہ بہ دختر دختر

صوفی کی شاہد بازی کی طرف ان کے دیوان میں واضح اشارہ ملتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

دلم از صحبت پسر بگرفت　　شاہد زہرہ وش ہمی خواہم[102]

تقی اوحدی[103] صوفی کی شخصیت اور اعلیٰ ظرفی پر روشنی ڈالتے ہوئے رقمطراز ہے کہ:

"از فاضلان زمان و دانایان دوران است ..... در سلک رندان خوش طبعان درآمدہ ..... بی تکلف و بی تعین می زیست والحق فطرت بغایت عالی دارد و تتبعات بسیار کردہ نہایت عنقا صفتی و غضنفر ہمتی دارد"

بقول صوفی: رباعی: دل آزادگان غمناک باید　　درون سینہ صد چاک باید

ازین دار فنا ہنگام رفتن　　حسابش با ہمہ پاک باید

(دیوان صوفی)

ملا قاطعی ہروی نے ملا محمد صوفی کے صوفیانہ مرتبے، زہد، ریاضت اور قناعت کی طرف مندرجہ ذیل الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

"مولد شریف ایشان از مازندران است و در وادی درویشیا و صوفیگری صوفی حق شناس و پرہیزگار بودہ اند، و در طریق صوفیان مرتکب حیوانی نمیشود و بہ شیر و نان چو نفس را تسکین دادہ قناعت می نمایند و ملا ریاضت کش بودند و سلوک خوب بہ پیش داشتند۔"

وفات | صوفی کی زندگی کے آخری لمحات بدحالی سے ہمکنار رہے، ان کے علمی اور صوفیانہ درجہ کا شہرہ بادشاہ وقت (شہنشاہ جہانگیر ۱۶۰۵ء / ۱۶۲۷ء) تک بہت دیر میں پہنچا تھا، بادشاہ نے انہیں بنفس نفیس مدعو کیا تھا۔ چنانچہ تذکرۂ صبح گلشن کے مولف نے صوفی کی شہرت اور انتقال کی خبر ان الفاظ میں دی ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

"بسکہ شہرہ فضل و کمال وی از زبان بعض اراکین بسامعۂ نور الدین محمد جہانگیر بادشاہ رسید۔ فرمان مطاع در طلب ملا محمد صوفی بنام حاکم کشمیر نافذ گردید و ملا بقصد حضوری حضور شاہی بر جناح استعجال تا شہر نو (سرہند) رسیدہ بود کہ یرلیغ قضا تبلیغ از حضرت مالک الملک جل جلالہ بامضاء حکم الیوا در جوار رحمت خود ورود فرمود بہ خط فرمان واجب الاذعان گردن نہاد در سنہ خمس و ثلثین و الف ہمانجا تن قضا درداد" (۱۰۳۵ھ)

تذکرۂ روز روشن کا مولف اس واقعہ کو یوں پیش کرتا ہے:

"در عہد اکبر بادشاہ بہند رسید و از امرای شاہی منقطع گردید، شہر گجرات را ورش کردہ و در آنجا اقامت گزید۔ در سنہ سی و چہارم از مائۃ یازدہم کہ

بتقریب بعض مقربان فرمان جہانگیر بادشاہ از لاہور بطلبش در گجرات رسید وی از آنجا روانۂ لاہور گردیدہ در میانۂ راہ بدار آخرت سر کشید و مصرعۂ رفتہ ملا محمد صوفی تاریخ وفات اوست۔"

اس ضمن میں تذکرۂ صبح صادق کا مولف[106] رقمطراز ہے کہ:

"او سالہا درین دیار (گجرات) ماند۔ و در اربع و ثلاثین و الف (۱۰۳۴ھ) جہانگیر بادشاہ او را بہ حضرت خود خواند۔ مولانا متوجہ لاہور گشت و در راہ در گذشت۔ بہر سال وفات او گفتم "رفتہ ملا محمد صوفی"۔"

یہ صحیح ہے کہ صوفی کا انتقال لاہور کے سفر میں ہوا۔ مولف صبح گلشن نے تصدیق کی ہے کہ صوفی نے سرہند کے مقام پر دار فانی کو لبیک کہا، البتہ صوفی کی وفات کے سنین میں معمولی سا فرق پایا جاتا ہے۔ تذکرۃ الشعراء کے مولف عبدالغنی فرخ آبادی نے صوفی کی تاریخ وفات کا ایک اور مادہ تاریخ دے کر اس گتھی کو سلجھا دیا ہے۔ عبدالغنی فرخ آبادی کی پیش کردہ تاریخ وفات ملاحظہ کیجئے:

"بجز دانہ یکی نشد بحق محمد صوفی" (۱۰۳۵ھ)

تذکرہ نویسوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ صوفی نے حالت نزاع میں شہنشاہ جہانگیر کے لیے ایک رباعی کہی تھی جس کو پڑھ کر بادشاہ وقت پر رقت طاری ہو گئی تھی ملاحظہ ہو:

رباعی:۔ اے شاہ نہ تخت و نہ نگین می ماند از بہر تو یک دو گز زمین می ماند
صندوق خود کاسۂ درویشان را خالی کن و پر کن ہمین می ماند

چند تذکرہ نویسوں نے صوفی کے انتقال کی بابت غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ ان میں رضا قلی ہدایت، تذکرۃ الشعراء کا نامعلوم مصنف[112] اور اورینٹل بائیو گرافیکل ڈکشنری کا

مولف ولیم بیل[113] شامل ہیں۔

گجرات سے والہانہ محبت

"تزک" میں شہنشاہ جہانگیر نے گجرات کے خطے کی مذمت کی ہے یہاں کے گرد و غبار، آب و ہوا کی کثافت اور کھارے پانی سے جہانگیر کو نفرت تھی لیکن اس کے برعکس صوفی کو اس علاقہ سے بے پناہ محبت تھی۔ صوفی سرزمین گجرات کو فردوس برین کشمیر پر فوقیت دیتے تھے۔ صوفی کے دیوان کا مطالعہ اس بات کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے کہ وہ گجرات (احمد آباد) میں کم اور شہر خوباں سورت میں زیادہ دنوں تک مقیم رہے چنانچہ کہتے ہیں ؎

(۱) محل من درایں سورتِ شاداب ملک است — مقام من درایں خورم دیار است[114]

(۲) مقر من از آن نشد شہر سورت — کہ دانستم این دار القرار است

خطہ گجرات سے صوفی کے والہانہ عشق کی روداد ہمیں ان کے قصیدے سے بھی ملتی ہے۔ صوفی نے صمیم قلب سے اس سرزمین کو نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

مرا گجرات از آن گشت مسکن — کہ از مازندرانم یادگار است

زمین او بہشت اندر بہشت است — ہوای او بہار اندر بہار است

بگجرات آرزو با خود مبر دل — کہ آنجا دلبر بابیش از شمار است

جمال اینجا ندارد با وفا جنگ — صباحت با ملاحت نیز یار است

غبار او عبیر حضر موتست — زمین او ولی مشک تتار است

در او مردم چو در میخانہ مستان — ز بس کآب و ہوایش سازگار است[115]

(دیوان صـ۱۱)

شاعرانہ حیثیت

صوفی کی طبیعت کا خمیر، شعر و شاعری، صوفیانہ آہنگ، رندو مستی،

عشق حقیقی اور عشق مجازی کی تمام تر کیفیات سے رچا ہوا تھا۔ فن شاعری پر انہیں عبور حاصل تھا اور وہ اس کی تمام نزاکتوں پر حاوی تھے۔ ان کی عشق آشنا طبیعت اور پاکیزہ ذہن سے آبدار اشعار نکلتے تھے۔ وہ شاعری کے آب حیات سے اپنی روح کی کثافت دور کرتے تھے۔ صوفی زبان کی چاشنی اور حلاوت سے زمانے کے قرطاس پر نہ مٹنے والا نقش چھوڑنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ لہٰذا ان خصوصیات کے پیش نظر ان کی شاعرانہ حیثیت مسلم تھی۔ صوفی نہ صرف بے نظیر و بے عدیل شاعر تھے بلکہ بقول صاحب میخانہ "قطب مرکز سخندانی"[116] کے اعزاز کے حامل تھے۔

صوفی کے کلام میں پائی جانے والی طرز ادا کی جدت اور پر کیف دلآویزی نے انہیں مقبول خاص و عام بنا دیا تھا۔ ان کی غزلیں بہاروں کے رنگ اور باد و باراں کی گھن گرج سے معمور ہیں۔ صوفی کے کلام میں دل کو چھو لینے والی کسک اور انداز بیان کی لچک بہت دلکش ہے۔ چنانچہ بقول خود:۔

غزلی گفتہ می شود دریاب — طرب انگیز تر ز باد و بہار[117]

ان باتوں کی تائید میں چند تذکرہ نویسوں کے خیالات پیش کیے جا رہے ہیں:

(۱) "اکثر سخنان او شور انگیز و اغلب اشعار او دلآویز و طرز حرف زدن او بقدر ما نند است"[118]

(۲) "شعرش خالی از لطف نیست"[119]

(۳) "بعلت ذوق و عرفان شعر عارفانہ و صوفیانہ می سرود"[120]

(۴) "الحق طرز خاص دارد"[121]

(۵) "شعرش در غایت جودت و ہمواری و متانت است"[122]

(۶) بقول خود ؎

درین عالم محمد آنچنان است	کہ در میخا نہا پرہیز گاران[123]

تعلی :- صوفی کو اس بات کا یقین تھا کہ وہ فن شعر میں یگانۂ روزگار ہیں۔ فصاحت اور بلاغت میں وہ خود کو "امراء القیس" اور "سحبان" سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ تعلی آمیز لہجے میں کہتے ہیں ؎

در فصاحت چو امراء القیسم	در بلاغت چنانکہ سحبا نم[124]

البتہ صوفی فارسی کے سربرآوردہ شاعر مسعود سعد سلمان کے معتقد تھے وہ کہتے تھے کہ اگر فلسفۂ آواگون کو جائز قرار دیا جائے تو انہیں محسوس ہوتا ہے کہ "مسعود سعد سلمان" کی روح ان کے جسم و جان میں حلول کر گئی ہے چنانچہ کہتے ہیں ؎

گر تناسخ رواست من بندہ	روح مسعود سعد سلما نم

دوسری جگہ کہتے ہیں ؎

مرا گرچہ طبعی است گیتی فروز	در ایران زمین چون چراغم بروز

(ساقی نامہ ص۸۵)

صوفی اپنی شاعری اور آہنگ شعر سے متعلق جدا جدا رائیں رکھتے تھے۔ کبھی شعر کو اپنی طبیعت کے آتشین شعلہ سے بہتا ہوا آب حیات کہتے، کبھی رائے کو انجم سوز اور طبیعت کو آسمان سے برستی آگ سے مشابہ کرتے، کبھی شاعری کے آب حیات سے مئے ارغوان کشید کرتے اور اس سے اپنی تکدر طبیعت کی کثافت و خباثت صاف کرتے جب کبھی ان کی پاکیزہ طبیعت رواں ہوتی تو وہ شیریں بیانی اور سخندانی کے رسیلے اور شفاف سوتے بہاتے۔ اس امر کی تصدیق میں صوفی کے چند اشعار پر غور فرمایئے ؎

آفتابیست رایم انجم سوز	آسمانیست طبعم آتش بار

	برون آمد چنان پاکیزہ شعر از طبع پاک او	کہ لولو از دل دریا و لعل از کان برون آید
۱	آب حیات شعر من آرید در میان	تا طبع از جنابت می شست و شو کنند
۲	زبان من شکر ریزی می کرد	ز نظم من در آن خورم عروسی
۳	نقشی است نظم بندہ (محمد) ز خون دل	بر صفحۂ زمانہ بس این یادگار را
۴	پر ز گوہر شود کنار و یم	بسخن چون زبان بجنبانم
رباعی	ای دیدہ ہنر بی جمالت بی نور	بی روی تو باد، دیدۂ انجم کور
	شعر تو چو آبست و لی آبحیات	طبع تو چو آتش است لیکن آتش طور

صوفی کی تصانیف | اس وقت تک صوفی کے پانچ کارنامے دستیاب ہیں۔ اس کے علاوہ چند تذکروں اور بیاضوں میں صوفی کا متفرق کلام دستیاب ہوتا ہے۔ راقم کے توسط سے صوفی کی دو مثنویوں (۱) حسب نامہ (۲) صوفی نامہ کا پہلی بار مختصر تعارف پیش کیا جائیگا۔

(۱) بتخانہ :- صوفی کے اس تذکرے میں ۱۲۴ شعراء سے متعلق مختصر معلومات اور ساٹھ ہزار اشعار کا انتخاب موجود ہے۔ یہ تذکرہ صوفی کی دیدہ ریزی، علمی، ادبی اور تحقیقی صلاحیت اور حسن انتخاب کا ضامن ہے[125]۔ صوفی نے اس تذکرے کا نام بتخانہ رکھا ہے کسی تسامح کے باعث ولیم بیل[126] نے اس کا نام "میخانہ و بت خانہ" تحریر کیا ہے۔ یہ تذکرہ نہایت نادر اور غیر معروف ہے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (شعبۂ فارسی) میں صوفی کے اس گرانقدر تذکرے پر تحقیقی کام جاری ہے۔

احمد گلچین معانی[127] بتخانے کی تعریف میں رقمطراز ہیں کہ :

"ملا محمد صوفی مازندرانی مدت چہل سال در دواوین و سفاین گردیدہ واز مجموع چہار صد ہزار بیت نزدیک بہ چہل ہزار بیت برگزیدہ و آنرا موسوم بہ بتخانہ .

گردانیدہ است۔"

گجرات کے بخشی حسن بیگ خاکی کی مدد سے سنہ ۱۰۱۰ھ مطابق ۱۶۰۱-۰۲ء میں تذکرۂ بتخانہ کی تالیف عمل میں آئی۔ احمد گلچین معانی اس کی تالیف کا زمانہ سنہ ۱۰۰۴ھ / ۱۵۹۵-۹۶ء[128] قرار دیتے ہیں۔ افسوس ہے کہ آج تک صوفی کا یہ تذکرہ زیور طبع سے آراستہ نہ ہو سکا۔ بتخانہ کی تعریف میں صوفی کے دیوان میں چند داخلی حوالے ملتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

(۱) چو من بتخانہ پیش خود دارم — گلستان ارم در پیش دارم

(۲) دو عالم را یکی بتخانہ کردم — مگر من معجزہ از حد بیش دارم[129]

بتخانہ کی تالیف کے پانچ سال بعد یعنی سنہ ۱۰۲۱ھ / ۱۶۱۲-۱۳ء میں عبداللطیف بن عبداللہ گجراتی نے اس میں ایک مقدمے اور کچھ معلومات کا اضافہ کیا اور اس کا نام "خلاصۃ الاشعار"[130] رکھا۔ بوڈلین کتب خانے کے فہرست نگار[131] کا خیال ہے کہ:

"عبداللطیف گجراتی در حقیقت کتاب صوفی را دزدیدہ است"[132]

(۲) ساقی نامہ:- ڈاکٹر امیر حسن عابدی لکھتے ہیں کہ "بتخانہ کے بعد (شہرت و مقبولیت کے لحاظ سے) ساقی نامہ[133] کی باری آتی ہے۔ حالانکہ یہ سنہ ۱۰۰۰ھ / ۱۵۹۱-۹۲ء میں لکھا گیا تھا۔ اکثر تذکرہ نویسوں نے ساقی نامہ کی تعریف کی ہے۔ عرفات کا مولف لکھتا ہے کہ "ساقی نامۂ او در شہرتی عظیم شدہ" اور صاحب میخانہ کہتا ہے "مولانا نے فرمایا۔۔۔ جس شخص کو میری شاعری کا درجہ معلوم کرنا ہو وہ میرے ساقی نامہ کو دیکھے کہ کیسا ہے؟ سچ تو یہ ہے کہ مولانا کا کہنا بالکل صحیح ہے[134]۔ صوفی کا ساقی نامہ کل ۲۸۵ اشعار پر مشتمل ہے۔ احمد گلچین معانی[135] اور طاہری شہاب[136] نے اسے طبع کر دیا ہے۔

(۳) دیوان ملا محمد صوفی:- ہماری دانست میں دیوان صوفی کے گیارہ قلمی مخطوطے اور

ایک مطبوعہ دیوان ہے۔

(۱) دیوان ملا محمد صوفی: مملوکہ بانکی پور، پٹنہ۔ جلد ۲ نمبر ۲۰۱ صفحہ ۹۶ (۲) دیوان ملا محمد صوفی، نیشنل میوزیم دہلی[1]۔ نمبر ۱۴۳/۳ / ۵۹ تعداد اشعار ۷۰۰ (۳) دیوان ملا محمد صوفی: فہرست اسپرنگر نمبر ۳۸۲ (۴) دیوان ملا محمد صوفی، کتابخانۂ سلطنتی تہران نمبر شمارہ ۱۰۱۸ (۵) دیوان ملا محمد صوفی، کتابخانۂ آستان قدس، مشہد نمبر ۵۴۱/۱۴۷۹، کتابت ۱۰۲۴ھ تعداد ۱۲۰۰ (۶) دیوان ملا محمد صوفی: کتابخانۂ حاج حسین آقا ملک تہران (۷) دیوان ملا محمد صوفی: مملوکہ طاہری شہاب ساری، تہران (۸) دیوان ملا محمد صوفی: کتابخانہ ہمبرگ جرمنی نمبر ۱۹۱ (فارسی) جلد نمبر ۴ (۹) دیوان ملا محمد صوفی: کتابخانہ میونخ جرمنی نمبر ۱۸-۶/۷ (۱۰) دیوان ملا محمد صوفی: کتابخانہ گنج بخش راولپنڈی، جلد دوم ۵۹۰/۳۵۴ (پاکستان)؛ (۱۱) دیوان ملا محمد صوفی: کتابخانہ مملوکہ مسعود حسن ادیب (مرحوم) لکھنؤ کتابت سنہ ۱۰۱۱ھ (۱۲) دیوان ملا محمد صوفی مطبوعہ تصحیح و تحشیہ سید محمد طاہری شہاب ۱۳۴۸ شمسی بسرمایۂ کتابخانہ ابن سینا۔

۴:- مثنویات صوفی بنام (۱) حسب نامہ (۲) صوفی نامہ: سالار جنگ میوزیم لائبریری حیدرآباد مخطوطہ نمبر ۱۷۲۲، جلد نمبر ۵ از اشرف، صفحات ۸۰، تاریخ کتابت ۱۱۵۱ھ/۱۷۴۴ء۔

---

[1] یہ قلمی نسخہ (کشکول) بقول ڈاکٹر امیر حسن عابدی صوفی کا خود نوشتہ کشکول ہے۔ اس میں عربی و فارسی نظم و نثر کا انتخاب موجود ہے۔ اس کشکول کے آخر میں دیوان صوفی شیرازہ بند ہے۔ مخطوطے کے منتخبہ اشعار اور اس کی قدامت ڈاکٹر عابدی کے قیاس کی تائید کرتے ہیں۔ راقم بھی ڈاکٹر عابدی کا ہمنوا ہے۔ اس کی ابتدا میں عربی و فارسی میں ایک مختصر سا مقدمہ ہے۔ اس کا کاغذ قدیم اور زرافشاں ہے۔ اس میں صوفی کے اشعار کی مجموعی تعداد ۷۰۰ ہے۔

اس مخطوطے میں صوفی کا ساقی نامہ اور دو مثنویاں ہیں۔ پہلی مثنوی حسب نامہ ۱۱۵۳ اشعار پر مشتمل ہے، اختتامیہ شعر کے بعد ایک ۱۰ اشعار کی غزل ہے۔ حسب نامہ کا آغاز مندرجہ ذیل شعر سے ہوتا ہے۔

صنع ایزد را کہ صنعت ور است	وز کمال حد عقل اولی تر است

ذیل کے اشعار میں شاید بادشاہ وقت (مغل اعظم جلال الدین اکبر) کی طرف اشارہ ہے:-

قرب شاہ از بہر جانب شد وبال	قرب حق آمد ترا عز و جلال
گر جلال حق بتو آمد معین	عز دارنیت (کذا) رسد زانسو قرین
قرب شاہت تراز حیوان کند	جانہا بستاند و بیجان کند
چونکہ جانت مایل عز است و جاہ	می گریزانی جان ز قرب بادشاہ

نقطوی فلسفہ کی طرف صوفی کا اشارہ ملاحظہ فرمایئے:

ہر تماشا پردہ دار روی تست	جملہ عالم نقطۂ ابروی تست

حسب نامے کا اختتام مندرجہ ذیل اشعار پر ہوتا ہے ؎

یاد تو باد امقیم ہر دلے	یا کلید راز ہائے مشکلے
مشکلم را الٰہی چارہ کن	خون خصم از نا ز فوارہ کن
یا الٰہی جملہ دلہا شاد باد	تا قیامت این جہان آباد باد

صوفی نامہ: صوفی کی ایک غزل کے بعد 'صوفی نامہ' کا آغاز ہوتا ہے۔ ابتدائی شعر یہ ہے۔

الٰہی بر دلم ز فیض اثر کن	بیانم را قبول ہر نظر کن

اس کے بعد عشق حقیقی کے رموز مندرجہ ذیل حکایتوں کے ذریعہ بیان کیے گئے ہیں۔ انداز بیان تمثیلی ہے

۱۔ حکایت گل و بلبل ۲۔ حکایت بلبل و زاغ ۳۔ ملامت کردن گل با باغبان ۴۔ تقریر کردن بلبل ۵۔ حکایت زاغ (نزد جوئبار) ۶۔ وغیرہ' وغیرہ۔

اس مثنوی میں بھی کم و بیش ایک ہزار سات سو آٹھ اشعار ہیں۔ اس کا اختتام بھی ایک غزل پر ہوتا ہے جس کا مقطع درج ذیل ہے۔

تمنا بس کہ افزودی لالے بیا صوفی رہائش کن	کہ مہر عشق با مستان ز مہر اشتہار آمد

مثنویات صوفی میں دستیاب شدہ غزلیں دیوان صوفی مرتبہ طاہری شہاب تہران میں نہیں ہیں۔ سنہ کتابت ۱۱۵۰ ہجری از فاضل بیگ کاتب)

صوفی نامہ کے اختتامیہ اشعار

بگو ای عشق بیداد بسیداد	ہمیشہ حسن مہرویان فزون باد
کہ ساقی چنبہ از مینا بر آرد	بجام جرعۂ دیگر نشارد

بگو برخیز و ختم ہر دعا را

بہر دم تازہ توحید خدا را

متفرق اشعار صوفی | بقول مولف "میخانہ" صوفی کے تین ہزار اشعار ادھر ادھر بکھرے ہوئے ہیں۔[۱۳] ان میں سے ۱/۴ حصہ ہماری دسترس میں ہے۔ صوفی جیسے جلیل القدر شاعر کے یہ بکھرے ہوئے موتی اور منتشر گوہر پارے اگر ایک جگہ جمع کر دیے جائیں تو فارسی ادب کا قیمتی سرمایہ اکٹھا ہو جائے گا۔ ذیل میں چند ماخذوں کی فہرست دی جا رہی ہے جو صوفی کے منتشر کلام کی تلاش و جستجو میں مدد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔

(۱) تذکرۂ بتخانہ از ملا محمد صوفی مازندرانی (۲) تذکرۂ مقالات الشعرا تالیف میر علی شیر (۳) تذکرۂ بستان عشاق از شہرہ (۴) تذکرۂ جواہر العجائب از فخری (۵) چند شاعر گمنام از گلچین معانی (غیر مطبوعہ) (۶) خرابات از خراب (۷) خلاصۃ الاشعار و زبدۃ الاشعار از ذکری (۸) تذکرۂ مجموعۃ العجائب ؟ (دانشگاہ تہران) (۹) ...... (بشمول ان تمام تذکروں کے جن کے حوالے مقالے میں شامل ہیں) (۱۰) فہرست مخطوطات فارسی از اشرف، سالار جنگ میوزیم، حیدر آباد۔ ہند، جلد نمبر ۵ مخطوطہ نمبر ۱۷۲۲ ؟ اور جلد نمبر ۱۷ از اشرف (دیکھئے صوفی)

منابع و ایرانی ماخذ

۱۔ جمالزادہ، محمد علی: "انتشار کتاب دیوان صوفی مازندرانی" وحید ۷ (۱۳۴۹)

۲۔ طاہری شہاب "محمد صوفی مازندرانی" ارمغان: ۲۷ (۱۳۳۶)

۳۔ گلچین معانی احمد "محمد صوفی مازندرانی" گوہر ۲ (۱۳۵۳)

۴۔ گودرزی، فرامرز "مختصری شرح حال محمد صوفی آملی" بہ ہمراہ زندگینامہ طالب آملی، ہنر و مردم، ۱۵، ش ۱۵۸ (آذر ۱۳۵۴)

۵۔ دیگر تیس منابع (ایران کے مختلف کتب خانوں کی بیاض وغیرہ)

حوالے

۸۸ رباعیات صوفی، مرتبہ طاہری شہاب: تہران ۸۸ و ۸۹ دیوان صوفی، ایضاً ۹۰ ڈاکٹر محمد صدیق، صدر شعبہ فارسی، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ (وظیفہ یاب) ۹۱ Some Persian Poets of Gujrat in the 19th Century, An article by Dr. Mohammad siddique: "The growth of Indo-Persian literature in gujrat, edited by M.M.siddique, Baroda, 1985, P.26

۹۲ دیوان صوفی، مرتبہ طاہری شہاب، تہران ۹۳ ایضاً ۹۴ ایضاً ۹۵ ایضاً ۹۶ و ۹۷ ایضاً ۹۸ ایضاً ۹۹ و ۱۰۰ ایضاً ۱۰۱ و ۱۰۲ ایضاً ۱۰۳ عرفات العاشقین ص ۱۰۴ تذکرۂ جہانگیر شاہی از ملا قاطعی ہروی ص ۳۹ مطبوعہ ۱۰۵ تذکرۂ صبح گلشن از منشی عبد العزیز ۱۲۹۵ھ بھوپال ص ۳۴۸-۳۴۹ ۱۰۶ روز روشن از صبا، ۱۲۹۷ھ ص ۷۱۵ ۱۰۷ بحوالہ میخانہ، مرتبہ گلچین معانی ص ۳۹۳ ۱۰۸ منشی عبد العزیز ص ۳۴۹ ۱۰۹ تذکرۃ الشعرا ۱۱۰ مآثر الامراء شاہنواز خاں ج ۳ ص ۴۴۷ - ۴۵۱ ۱۱۱ ریاض العارفین تاریخ وفات غلط درج ہے۔ "بخواہش جہانگیر از کشمیر بدہلی رفتہ در سنہ ۱۰۳۵ھ در سرہند وفات یافت ۱۱۲ تاریخ وفات ۱۰۳۰ھ درج ہے۔ بحوالہ مقالہ، ڈاکٹر امیر حسن عابدی، جامعہ، نومبر ۱۹۷۳ء ۱۱۳ تاریخ وفات ۱۰۳۵ھ درج ہے۔ ص ۲۷۳ ۱۱۴ و ۱۱۵ دیوان صوفی: مرتبہ طاہری شہاب، تہران ۱۱۶ عبد النبی ص ۳۴۷ ۱۱۷ دیوان صوفی ۱۱۸ میخانہ ص ۳۴۰ ۱۱۹ مآثر الامراء جلد ۳ ص ۴۵۱ ۱۲۰ تذکرہ نویسی فارسی ہند و پاک از نقوی ص ۱۳۵ ۱۲۱ تذکرۂ لطائف الخیال ۱۲۲ تذکرۂ ہفت اقلیم از امین احمد رازی ص ۱۲۸ / ۱۳۲ ۱۲۳ دیوان صوفی، مرتبہ طاہری شہاب، تہران ۱۲۴ ایضاً امراء القیس جاہلی عرب کا نامور شاعر اور سحبان مشہور مقرر و خطیب تھا ۱۲۵ تذکرۂ ہفت اقلیم از رازی ص ۱۲۸ مطبوعہ ۱۲۶ اور ینٹل بایوگرافیکل ڈکشنری از ولیم بیل ص ۲۷۳ ۱۲۷ تاریخ تذکرہ ہای فارسی: احمد گلچین معانی ص ۵۹ ۱۲۸ ایضاً ۱۲۹ دیوان صوفی: مرتبہ طاہری شہاب، تہران ۱۳۰ فہرست مخطوطات بانکی پور، پٹنہ، المقتدر ص ۷۶ نمبر ۳۰۱ خلاصۃ احوال الشعراء ۱۳۱ ایتھے، ہرمن: اور تذکرہ نویسی ہند و پاک، ص ۱۳۵ / تاریخ تذکرہ ہائے فارسی ص ۵۹۱ ۱۳۲ بوڈلین لائبریری کیٹلاگ، لندن، از ایتھے، ص ۳۴۶ ۱۳۳ از صوفی مازندرانی ۱۰۳۰ھ ۱۳۴ میخانہ: عبد النبی، مرتبہ گلچین معانی / عرفات اوحدی ص ۱۰۰ ۱۳۵ بحوالہ جامعہ، مقالہ از ڈاکٹر عابدی، نومبر ۱۹۷۳ ص ۲۳۵ ۱۳۶ دیوان صوفی، مرتبہ طاہری شہاب، تہران ۱۳۷ عبد النبی۔

علمائے خراسان کے سوالات اور شیخ شہاب الدین عمر سہروردی کے جوابات ٭

از ڈاکٹر احمد طاہری عراقی

ترجمہ: ڈاکٹر سید حسن عباس

"تصوف و عرفان میں شیخ الاسلام شہاب الدین عمر بن محمد سہروردی (۵۳۹-۶۳۲) یقیناً بزرگ ترین عرفا میں سے ایک ہیں انھوں نے اپنے سلف امام ابو القاسم قشیری (۳۷۶-۴۶۵) کی طرح سنت و شریعت کے حدود میں تصوف کے تحفظ اور بدعت گذاروں" کی آرا سے اسے پاک کرنے میں موثر کردار ادا کیا ہے۔ ان کی معروف تصنیف عوارف المعارف وہ اہم کتاب ہے جس میں انھوں نے اسلامی عرفان کے اصول و مبانی اور آداب و اخلاق کو منظم کیا ہے، اس کتاب نے ساتویں صدی ہجری سے آج تک سبھی سلسلہ ہائے طریقت اور حلقہ ہائے عرفان پہ گہرا معنوی اثر مرتب کیا ہے۔ شیخ شہاب الدین اپنے عہد کے بڑے محترم شیخ طریقت تھے اگرچہ وہ ابن عربیؒ ابن فارضؒ، نجم الدین کبریٰؒ، نجم رازی، بہاء ولد اور سعد الدین حموی وغیرہ جیسے

٭ یہ رسالہ "مقالات و بررسی ہا" نشریۂ گروہ تحقیقاتی دانشکدۂ الہیات و معارف اسلامی تہران کے شمارہ ۵۰-۴۹ (۱۴۱۱ھ) ۱۳۶۹ش میں شایع ہوا تھا۔

بڑے عرفا کے ہم عصر تھے جن میں سے ہر ایک اپنی جگہ خصوصی اہمیت کے حامل تھے، لیکن شہاب الدین کی علمی جامعیت اور شافعی فقہ و حدیث میں استادانہ مہارت، زہد و ورع وتقویٰ، شریعت و سنت کی حدود کی حمایت اور مسائل طریقت میں ان کے اعتدال نے انہیں ان کے معاصر مشایخ میں ممتاز بنایا اور عوام کے مختلف طبقات میں مقبولیت بخشی۔ ابن فارض ان سے ملاقات کے لیے گئے اور ابن عربی نے انہیں "عبد صالح" کہا ہے۔ سعدی شیرازی ان سے عقیدت رکھتے تھے۔ ان کے زمانے میں تصوف کے جو سلسلے منظم اور مکمل شکل میں سامنے آچکے تھے اور دور و نزدیک کے اکثر علاقوں میں ان کی جتنی خانقاہیں، تکیے اور سرائیں تھیں ان کا تعلق شیخ شہاب الدین سے تھا اور وہ ان کے ارشادات و تحریروں سے استفادہ کرتے تھے۔[1]

شیخ الاسلام سہروردی مرجع خواص تھے اور اہل سلوک، اصول و فروع یا اعمال و آداب کے سلسلے میں ان سے سوالات کرتے تھے، ان سوالات و جوابات میں سے بعض مدون ہو کر رسائل کی شکل میں موجود ہیں۔ دوسرے اسلامی علوم کی طرح عرفان میں بھی سوال و جواب پر مشتمل بہت سے رسائل ملتے ہیں، اس قسم کے اکثر رسائل نکات و دقائق پر مشتمل ہیں، اگرچہ یہ نکات و دقایق بعض کتب و آثار میں

[1] شیخ الاسلام شہاب الدین عمر سہروردی کے بارے میں تفصیل کے لیے دیکھیں: وفیات الاعیان ۳/۱۱۹-۱۲۰؛ طبقات الشافعیہ سبکی ۸ / ۳۳۸-۳۴۱؛ شذرات الذہب ۵/۱۵۳-۱۵۵؛ مقدمۂ مرحوم استاد جلال الدین ہمائی بر مصباح الہدایۃ ۱۹-۳۱؛ ترجمۂ عوارف المعارف بکوشش قاسم انصاری تہران ۱۳۶۴؛ اور دائرۃ المعارف اسلام طبع اول میں فان ونبرگ کا مقالہ۔

پائے جاتے ہیں پھر بھی سوال و جواب پر مشتمل رسالوں کی تاریخی اہمیت اپنی جگہ باقی ہے ان سے یہ پتا چلتا ہے کہ کسی خاص زمانے یا حلقے میں کیا مشکلات موجود تھیں اور کس قسم کے سوالات درپیش تھے اور یہ بات مذہبی اور فکری تبدیلیوں کی تاریخ کی شناخت میں بڑی معاون ہو سکتی ہے۔

شیخ الاسلام سہروردی کی تصانیف میں ایک رسالہ سوال و جواب پر مشتمل ہے جس کا ایک نسخہ کتب خانۂ ظاہریہ دمشق میں موجود ہے اور یہ اٹھارہ[۱۸] سوال و جواب پر مشتمل ہے۔ اس کا دوسرا نسخہ کتب خانۂ مجلس شورائے اسلامی تہران میں ہے۔ لیکن ہلمٹ ریٹر نے جس نے استنبول کے مخطوطات کی بنیاد پر سہروردی کی تصانیف کی فہرست تیار کی ہے۔ اس رسالے کا ذکر نہیں کیا ہے[۲]۔ ابن خلکان کے بیان سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ اس رسالے سے (یا کم از کم اس کے بعض سوال و جواب سے) ساتویں صدی میں بعض لوگ واقف تھے۔ (ابن خلکان ۶۰۸-۶۸۱) شہاب الدین سہروردی کے ہم عصروں میں تھا اور اس نے شیخ کے مصاحبین اور مریدوں سے ان کے بارے میں حکایتیں سنی تھیں، البتہ ان کے سفر اربیل کے وقت، کم سنی کی وجہ سے وہ ان سے ملاقات نہیں کر سکا تھا[۳]۔ ابن خلکان نے مختلف شہروں کے مشایخ طریقت اور شیخ شہاب الدین کے درمیان خط و کتابت اور ان سے استفتا کی طرف اشارہ کرنے کے بعد "عمل" اور "عجب" کے بارے میں سوال و جواب کا ذکر کیا ہے اور یہ زیر بحث "رسالۂ اسئلہ واجوبہ" کا دوسرا سوال ہے گو الفاظ میں فرق پایا جاتا ہے۔ ابن خلکان

[۲] H.Ritter — "Philologika IX" Der Islam, 25 (1938) 36 sepp.

[۳] وفیات الاعیان ۳/ ۱۲۰۔

نے اس سوال و جواب کا ذکر صرف استفتا اور فتویٰ کی صورت میں کیا ہے کسی مدون رسالے کے جز کے طور پر نہیں۔ ہمیں یہ نہیں معلوم ہے کہ یہ رسالہ واقعی خراسان کے بعض مشایخ کے سوالات کا کوئی مدون مجموعہ ہے جو مختلف وقت میں شہاب الدین سے کیے گئے اور انھوں نے جواب دیا ہے یا یہ کہ تمام کے تمام اٹھارہ سوالات کسی ایک وقت میں خراسان کے کسی صوفی نے شیخ کی خدمت میں بھیجے ہیں۔

کتابخانہ ظاہریہ کے نسخے میں رسالے کا نام درج نہیں ہے۔ فہرست میں اس کا نام "اجوبۃ عن اسئلۃ علمائے خراسان" دیا گیا ہے[۴]۔ رسالے کی پہلی سطر یوں شروع ہوتی ہے" ھذہ اسئلۃ کتبھا بعض ائمۃ خراسان واجاب عنھا شیخ الاسلام السھروردی"۔ مجلس شورائے اسلامی کے نسخے میں رسالے کا نام یوں آیا ہے: "وھذہ مسائل کتب بھا[کذا] الیہ بعض ائمۃ خراسان فاجاب عنھا"۔

رسالے میں اٹھارہ[۱۸] سوال و جواب بغیر کسی ترتیب کے ایسے مختلف مسائل کے بارے میں ہیں جو اس زمانے میں صوفیوں کے درمیان پائے جاتے تھے یعنی اعمال وسلوک میں مریدوں کو پیش آنے والے سوالات و مشکلات اور صوفیہ پر دوسروں کی طرف سے کیے جانے والے شبہات و اعتراضات۔ ان سوالات وجوابات کو موضوع کے اعتبار سے تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

الف: صوفیہ کے اعمال و آداب کی شرعی توجیہ | پانچواں اور چھٹا سوال بظاہر اہل ظاہر کے

[۴] محمد ریاض المالح: فہرس مخطوطات دار الکتب الظاہریۃ التصوف ج ۱ ص ۲۱-۲۲۔ نسخہ میں چھ ورق میں بقطع ۵/ ۲۳ × ۱۶ سم بخط نسخ خوب و بغیر تاریخ۔

اقوال اور صوفیوں پر ان کے اعتراض میں ہے۔ وہ خلوت اور خرقہ وغیرہ جیسے اعمال وآداب کو "بدعت" سمجھتے تھے اس لیے کہ نہ تو کتاب وسنت میں اور نہ زمانۂ صحابہ ہی میں اس کا کوئی وجود ہے۔ سہروردی کہتے ہیں کہ جن صحابۂ کرام کو آنحضرت (صلعم) کے دیدار کا شرف حاصل تھا اور وہ رسول اللہ (صلعم) کی خدمت میں رہا کرتے تھے، انہیں "خلوت" کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ خلوت، آفات نفس کو دور کرنے کا ایک وسیلہ ہے اور اگر یہ کام کسی اور طریقے سے ہوجائے تو خلوت کی کوئی ضرورت نہیں۔ کبھی مرید کو خلوت اختیار کیے بغیر یا تنگ وتاریک حجرے میں بیٹھے بغیر ہی صحبت شیخ کی برکت سے وہ مقام مل جاتا ہے جہاں اسے پہنچنا چاہیے۔ پس خلوت صرف بعض مریدوں کے لیے ضروری ہے نہ کہ سب کے لیے' یہ سلوک کا لازمہ بھی نہیں ہے۔

"خرقہ" بھی سلوک کے لوازم میں سے نہیں ہے بلکہ ان "مستحسنات" میں ہے جو مشایخ نے وضع کیے ہیں[۵]۔ اسکے باوجود بقول سہروردی' سنت نبوی میں بھی خرقہ پہننے کے لیے روایت مل سکتی ہے، روایت کی گئی ہے کہ رسول کرم (صلعم) نے ام خالد[۶] کو

---

۵ استحسان سے مراد' استحباب امر اور اس رسم کا اختیار کرنا ہے جسے طالب کی صلاح کے لیے صوفیوں نے اپنے اجتہاد سے وضع کیا ہے بغیر اسکے کہ سنت سے اس کی واضح اور آشکار دلیل ہو، (مصباح الہدایۃ ومفتاح الکفایۃ: ۱۴۶) ۶ ام خالد' امۃ بنت خالد بن سعید بن العاص کی کنیت ہے وہ اپنے والد کی حبشہ ہجرت کے دوران پیدا ہوئیں اور برسوں کے بعد حجاز واپس آئیں اور حضرت زبیر بن العوام سے شادی کی اور عمر بن زبیر و خالد بن زبیر انہیں کے بیٹے ہیں (طبقات ابن سعد ۸/۱۶۹-۱۷۰؛ الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب ۴/۱۷۹۱؛ الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ ۴/۲۳۸؛ اسد الغابۃ ۷/۲۴ و ۳۲۵]

سیاہ لباس پہنایا تھا[۷]۔ بطور تبرک اولیا و مشایخ سے خرقہ (یا کسی اور لباس) کی طلب بھی جائز ہے اور یہ بدعت نہیں ہے اس لیے کہ حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے پیغمبر کے جسم پر ایک چادر دیکھی جسے ایک عورت نے خود اپنے ہاتھوں سے تیار کیا تھا اور حضرت کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ اس صحابی نے رسول (صلعم) سے وہ چادر مانگی اور حضرت نے اسے دیدیا[۸]۔ خرقہ پوشی میں پیر سے مرید کی صحبت اور اس سے علوم واحوال کسب کرنے کا اعتبار ہوتا ہے۔ شیخ سے خرقہ حاصل کرنا اپنی خواہشات سے دستبردار ہونے اور شیخ کے حکم پر عمل کرنے کا "رمز" ہے اس لیے کہ راہ سلوک میں تربیت کرنے والا شیخ جو کچھ کہتا ہے اور سالک کی تربیت میں جو کچھ مناسب سمجھتا ہے سالک کو اسی پر عمل کرنا چاہیے اور اپنی خواہش کو ختم کردینا چاہیے' خرقہ اسی غرض وغایت کا "رمز" ہے، جو ان شرائط پر خرقہ حاصل کرے وہ حقیقی ہے' ورنہ ظاہری اور صوری اعتبار سے وہ ایک مرید ہے جو صرف ہیئت وصورت کے لحاظ سے اس گروہ میں شامل ہوگیا ہے۔

ب: مسائل مشیخت

شیخ شہاب الدین سہروردی کے زمانے میں اکثر اسلامی علاقوں میں خانقاہیں' تکیے اور خلوتکدے تعمیر ہوچکے تھے اور ان کے لیے اوقاف کا انتظام تھا اور وہاں بہت سے مشایخ ہدایت وتربیت میں مصروف تھے۔ دوسری جماعتوں کی

---

۷ اس حدیث کا ذکر شیخ الاسلام سہروردی نے عوارف المعارف میں سند کے طور پر کیا ہے اور اسے خرقہ پوشی کے لیے بنیاد بتایا ہے [عوارف المعارف/۹۶-۹۷؛ ترجمہ فارسی/۴۱-۴۲؛ مصباح الہدایۃ/۱۴۷-۱۴۸] بخاری نے اپنی صحیح میں [کتاب اللباس: ۲۲-۳۲] اس کا ذکر کیا ہے ۸ دیکھیں: متن رسالہ کا حاشیہ ۱۵۔

طرح ان مشایخ میں بھی کبھی کبھی ایسے افراد نظر آجاتے تھے جو عوام فریب، جاہ طلب اور مال
ودولت سمیٹنے والے بھی تھے۔ ایسی صورت میں سالک راہ کے لیے دشواری ہوتی تھی کہ
کھرے کھوٹے میں کس طرح تمیز کرے اور سچے تربیت کرنے والے عارفوں اور جھوٹے
دعویداروں کی شناخت کیونکر ہو، سولھواں اور سترھواں سوال اس مشکل سے
متعلق ہے۔

شیخ شہاب الدین کہتے ہیں: حرص، مال اندوزی اور جاہ طلبی غفلت اور
خواہشات بڑھانے کا نتیجہ ہوتی ہے اور جس میں یہ صفات پائی جاتی ہوں۔ وہ شیخ
نہیں۔ مشیخت تو اس کے شایان شان ہے جس نے ہوی وہوس کے دیو کو مار ڈالا ہو
اور حرص و آز کا گلا گھونٹ ڈالا ہو۔

مرید کو بھی صرف ظن وگمان پر عمل نہیں کرنا چاہیے اگر شیخ سے کسی ناروا کام کے
سرزد ہونے کا مشاہدہ کرے تو خدا سے دعا کرے کہ اس شیخ کی حقیقت حال اس پر
کھول دے۔ سچے شیخ کو عوام کو اپنی طرف بلانے کی ضرورت نہیں ہوتی، اہل حق
خود ہی اسے پالیں گے، حق تعالیٰ اس کی محبت دلوں میں ڈال دیتا ہے اور وہ علم اور
مریدوں کے الہام کا امین قرار پاتا ہے۔

سولھویں سوال میں لوگوں نے دریافت کیا ہے کہ مرید، ذکر کی تلقین شیخ سے
حاصل کرے یا خود ہی کوئی ذکر و ورد اختیار کرلے؟ سہروردی کہتے ہیں: ذکر تو شیخ
سے ہی حاصل کرنا چاہیے، لیکن شیخ کو کامل و عارف اور روشن دل ہونا چاہیے کیونکہ ذکر
کی تلقین مرید کے باطن میں شیخ کے دم پھونکنے اور حرف کی روشنی کے دل کی روشنی کے
ساتھ ملنے کا نام ہے اور جس قدر ہوائے نفس زائل ہوگی نورانیت قلب اتنا ہی بڑھتی

جائے گی اور جب خواہشات پوری طرح ختم ہوجائیں گی تو دل نور ہوجائے گا اور جو
"کلمہ" بھی اس دل سے نکلے گا اور مرید تک پہنچے گا، نور کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

ج: مسائل مریدان | تیسری قسم کے سوالات ان مشکلات کے بارے میں ہیں جن
سے مرید کو سلوک وطریقت کے اعمال اور معاشرتی امور مثلاً خلوت وخدمت، طلب علم،
ازدواج، آفات عمل، مالداروں سے سلوک، سلاطین کی خانقاہوں اور تکیوں کے
استعمال اور فتوح قبول کرنے کے سلسلے میں سامنا ہوتا ہے۔

۱۔ خلوت یا خدمت:- خلوت یا خدمت سالکوں کی استعداد کے مطابق
تجویز کی جاتی ہے، جو چاق و چوبند ہو اور اپنا سارا وقت عمل و مراقبہ میں گزار سکتا ہو
اسے خلوت اختیار کرنا چاہیے لیکن جو ایسا نہ ہو، اس کے لیے خدمت کرنا ہی بہتر ہے۔
اسے اپنے وقت کا کچھ حصہ اعمال و اوراد و اذکار و مراقبہ اور غور وفکر میں گزارنا
چاہیے اور جن اوقات میں اس پر بطالت طاری ہو اس کو چاہیے کہ وہ فقیروں کی خدمت
اور مسکینوں کی مدد میں صرف کرے (تیسرا جواب) اور اس مرید کو جو روشن دل
شیخ کی نگرانی میں سلوک میں مشغول ہے شیخ کے حکم سے خلوت اور خدمت اختیار
کرنا چاہیے۔ شیخ عارف سالک کی توانائی اور استعداد سے آگاہ ہوکر ہی اس کے
لیے خلوت یا خدمت تجویز کرتا ہے (چوتھا جواب) لیکن سالک کو خلوت نشین راہبوں
کی طرح ہمیشہ خلوت میں نہیں رہنا چاہیے، جماعت کے ساتھ فرائض ادا کرنا چاہیے
اور پریشانی خاطر کی وجہ سے جمعہ وجماعت ترک نہیں کرنا چاہیے (پانچواں جواب)

۲۔ عمل:- جن اوقات میں سالک عوام کے ساتھ ہوتا ہے اعمال عبادت کی
لذت اس کے لیے زیادہ ہوجاتی ہے اور تنہائی میں اس کے عمل میں فتور پیدا ہوجاتا ہے۔

لیکن اسے ریا کے خوف اور خلق پر توجہ سے یہ عمل ترک نہیں کرنا چاہیے۔ سالک کو جاننا چاہیے کہ خلق سے نہ کوئی فائدہ ہے اور نہ کوئی نقصان۔ وہ خدا کی پناہ حاصل کرے اور اس سے مدد کا طالب ہو اور استغفار کرے، عمل سے اس وقت تک ہاتھ نہ کھینچے جب تک اس کی برکت سے ریا ختم ہو جائے (دسواں جواب)

اسی طرح عُجب ہے جو کبھی عمل اور عبادت کے ساتھ سالک کے نفس میں پیدا ہو جاتا ہے۔ اس عُجب کا علاج ترک عمل نہیں بلکہ اعمال کے ساتھ ہے۔ اسے جاننا چاہیے کہ یہ عُجب نفس سے ہے اور اسے اپنے سے دور کرنے کی کوشش کرے (دوسرا جواب)

۳۔ تعلّم و تزہد :۔ اس سوال کے جواب میں کہ آیا سالک کے لیے بہتر ہے کہ سب سے رشتہ توڑ لے اور صرف خدا کی عبادت میں مشغول رہے یا یہ کہ علم حاصل کرے اور احکام و واجبات کی تعلیم حاصل کرے۔ شہاب الدین کہتے ہیں : سالک اگر ضرورت کی حد تک احکام کا علم رکھتا ہو تو اس کے لیے عبادت اور خدا کی پناہ حاصل کرنا اولیٰ تر ہے، لیکن اگر اس کا نفس عمل پر آمادہ نہ ہوا ہو اور فتور و بطالت کی طرف مائل ہو تو اسے چاہیے کہ اپنے اوقات کا ایک حصہ ان علوم میں گذارے جو فرض کفایہ ہیں اور اس طرح کی عبادت اور تبتّل عزیمت حال ہے اور علم سے یہ وابستگی رخصت۔ (ساتواں جواب)

۴۔ ازدواج :۔ دریافت کیا گیا ہے کہ سالک مجرد جسے شادی کا خیال آتا ہے، کیا کرے؟ شادی کرے؟ یا عبادت اور مجاہدۂ نفس سے شادی کا خیال ذہن میں نہ آنے دے؟ شیخ شہاب الدین کہتے ہیں: اس زمانے میں بہتر

یہ ہے کہ سالک، خدا کی عبادت، دعا، توفیق الٰہی نیز صالحین کی توجہ اور ارواح اولیٰ سے توسل کے ذریعہ ازدواج سے دوری اختیار کرے اور دل سے بیوی ازدواجی زندگی اور شادی بیاہ کا خیال نکال دے۔[۵] کچھ عرصہ اسی روش پر عمل کرے جب تک کہ خداوند قدوس ایک پارسا بیوی اسے نصیب نہ کر دے (آٹھواں جواب) اور سالک جب شادی کر لے تو اسے اپنے افراد خاندان کے لیے کسب معاش کرنا چاہیے (نواں جواب)

۵۔ ثروت مندوں سے معاشرت :۔ سالک کو اغنیاء کی دولت کی وجہ سے نہ ان کے سامنے عجز و فروتنی ظاہر کرنا چاہیے اور نہ ہی اپنی کوئی حاجت ان کے سامنے پیش کرنا چاہیے البتہ شدید ضرورت کے وقت اس کی اجازت تو ہے مگر اس وقت کلیۃً ان پر انحصار نہیں کرنا چاہیے اور اگر اسے یہ معلوم ہو کہ ان کا مال حرام ہے تو اسکا لینا جائز نہیں۔ حال و مقام کی بلندی سے سالک میں غرور پیدا نہیں ہونا چاہیے جو حرام و حلال کی تفریق میں بے پروا بنا دے۔ سچے سالک، مباح سے بھی پرہیز کرتے ہیں تو مشکوک مال کی بات ہی کیا ہے۔ البتہ شدید ضرورت پر یا ہلاک ہونے کا خوف کے موقع پر [اجازت ہے] لیکن حرام چیز کھانا مطلقاً جائز نہیں ہے (گیارھواں جواب)

---

[۵] صوفی کا مجرد رہنا یا شادی کرنا دونوں ہی خدا کے لیے ہے اور ان میں کوئی ایک عمل بھی نہ طریقت کے لیے مانع ہو اور نہ سلوک میں سستی کا باعث ہو۔ (عوارف ۱۶۳) اور شیخ کی یہ بات مبتدی مریدوں کی تربیت کے پیش نظر تجرد کی فضیلت میں ہے اور اس مفہوم کو جو عوارف (ص ۱۶۳ - ۱۶۷) میں بھی آیا ہے شیخ عز الدین کاشانی نے بھی مصباح الہدایۃ ص ۱۵۵ - ۲۵۶ میں بیان کیا ہے۔

اسی طرح فتوح کے باب میں' ہر چیز قبول نہیں کرنی چاہیے مگر بوقت ضرورت
اور دو مشکوک مال میں سے جو کم مشکوک ہو اسے قبول کرے (تیرہواں جواب)
کہتے ہیں ایسے درویش بھی ہیں جو کھانے پینے میں کوئی احتیاط نہیں کرتے۔ ضرورت کے
بغیر جو کچھ انہیں دیا جاتا ہے وہ واپس نہیں کرتے۔ شہاب الدین کہتے ہیں: مجبوری
کے علاوہ وہ جائز نہیں ہے اور جو سچا درویش ہے اس کو اس سے بھی پرہیز کرنا
چاہیے۔ کھانے میں احتیاط نہ کرنا اور لاابالی رہنا ہلاکت کا باعث ہے۔

۶. خانقاہیں اور اوقاف :- امراء و سلاطین کی تعمیر کردہ خانقاہوں اور حجروں
میں سکونت جائز ہے بشرطیکہ [وہاں قیام کے دوران] اوقاف سے کھانا نہ کھائیں[۱]
مگر وہ جو تکمیل سلوک کر چکے ہیں ان کے لیے اوقاف کا استعمال' بیمار کے علاج اور سخت
ضرورت کے وقت زندگی کی بقا کے مترادف ہے۔ (بارہواں جواب)

جیسا کہ اشارہ کیا گیا' شیخ شہاب الدین کے رسالۂ اجوبہ کے دو نسخوں کا ہمیں
علم ہے۔ ایک کتابخانۂ ظاہریہ دمشق (مکتبہ الاسد بشمارۂ: ۴۶۵۳) اور دوسرا
کتابخانۂ مجلس شورائے اسلامی شمارہ ۲ تہران (بشمارۂ: ۹۵۴) مجلس کا نسخہ
متفرق رسالوں کے اس مجموعے میں شامل ہے جن میں سے بعض کی تاریخ

---

۱. شیخ نے عوارف (ص ۱۱۵) میں بھی مسافر صوفیوں کو اوقاف اور کاروانسرائے
وغیرہ کے استعمال سے منع کیا ہے مگر یہ کہ خانقاہ کا شیخ اجازت دے دے "فلا ینبغی
ان یاکل من مال الرباط بل یکتسب و یاکل من کسبه ... الا ان یکون
تحت سیاسة شیخ عالم بالطریق ینتفع بصحبته و یهتدی بهدیه فیری
الشیخ ان یطعمه من مال الرباط ..."

کتابت ۶۵۲ھ ہجری ہے یعنی سہروردی کی وفات کے بیس سال بعد۔ نسخۂ ظاہریہ
میں تاریخ کتابت نہیں ہے وہ مجلس کے نسخے سے متاخر ہے۔ نسخۂ مجلس نسخۂ
ظاہریہ سے قدرے مختصر ہے اس میں اٹھارہ سوالات (علاوہ سوال اول و دوم)
کا متن نہیں ہے جوابات کے متن سے بھی بعض جملے حذف ہوئے ہیں یا ان کی تلخیص
کی گئی ہے۔ علاوہ بریں اس میں سولہویں اور سترہویں جواب باہم خلط ملط ہو گئے
ہیں اور پندرہویں سوال کے جواب کے بعد سولہویں نمبر کے ساتھ مختصر سا جواب
یوں آیا ہے "یحتسب و یستغفر من رؤیة نفسه" اس طرح جوابات
کی تعداد انیس (۱۹) ہو گئی ہے۔

نسخۂ مجلس میں نقائص کے پیش نظر تصحیح کے وقت نسخۂ ظاہریہ کو مکمل' صحیح و
دقیق ہونے کی بنا پر اصل نسخہ قرار دیا ہے اور اس کا نسخۂ مجلس سے مقابلہ کیا ہے
البتہ بعض مواقع پر نسخۂ مجلس کی روایت کو متن قرار دیا گیا ہے۔ اختصار کے پیش نظر
نسخۂ مجلس کے نقائص کا ذکر حواشی میں نہیں کیا ہے۔ حواشی میں "ظا" کی علامت
نسخۂ ظاہریہ اور "مج" کی علامت نسخۂ مجلس کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

ایک گمنام اردو مثنوی پیکرِ حسن

از ڈاکٹر لطیف حسین ادیب

اردو مثنوی نگاری میں نئے رجحانات انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں پیدا ہوئے جس کا سبب تحریک تعلیم۔ اخبارات و رسائل کی اشاعت اور تعلیمی و فلاحی انجمنوں کا قیام ہو سکتا ہے۔ قدیم علوم کے ساتھ مغربی ادب اور مغربی سائنسی ترقی اور نظریات سے واقفیت پیدا ہوئی۔ اخبارات اور انجمنوں کے ذریعہ نئے خیالات کی اشاعت ہوئی اور ایسی تحریکات نے بھی جنم لیا جن کے ذریعہ بیداری اور ترقی کا شعور پیدا ہوا۔ خود شعرائے اردو نے قدیم رنگ اور جدید رنگ کی امتیازی حدیں مقرر کیں۔ اردو مثنوی کے نئے رجحانات کے سلسلے میں مذہبی رجحان کا سراغ محسن کاکوروی (م ۱۹۰۵ء) کی نعتیہ مثنویات "چراغ کعبہ" اور "صبح تجلی" اور بنواری لال شعلہ (م ۱۹۰۳ء) کی کرشن بھگتی پر منحصر مثنوی "بزم بندرابن" سے ملتا ہے۔ اخلاقی اور اصلاحی رجحان کا اظہار الطاف حسین حالی (م ۱۹۱۴ء) کی مثنوی "رحم و انصاف" اور محمد حسین آزاد (م ۱۹۱۰ء) کی مثنویات "شب قدر"۔ "حب وطن"۔ "صبح امید" اور "خواب امن" سے ہوا۔ مغربی فلسفے اور طبیعیات کے اثرات بھی مرتسم ہوئے۔ احمد علی شوق (م ۱۹۲۵ء) نے مثنوی عالم خیال تحریر کی اور اسی انداز کی دیگر مثنویات بھی تالیف کیں جو اس کے مجموعۂ مثنویات "گنجینہ" میں شامل ہیں۔ مثنوی نگاروں نے ہندوستان کے موسموں پر

مثنویات تحریر کیں۔ حالی کی مثنوی "برکھا رت"۔ آزاد کی "ابر کرم" اور احمد علی شوق کی "بہار برسات" کا موضوع ہندوستان کے موسم اور ان کی دلفریبی ہے۔ عشقیہ مثنویات اس عہد کی سماجی فضا میں تحریر ہوئیں جس کی وجہ سے لذت پرستی کا میلان زیادہ ہوا اور جمالیات عشق کی جگہ ابتذال نے لے لی۔ ارشد علی خان قلق (م ۱۸۷۹ء) کی مثنوی "طلسم الفت" اور نواب مرزا شوق (م ۱۸۷۱ء) کی مثنوی "زہر عشق" لذت پرستی کے رجحان کا نمونہ ہیں۔

بریلی کی تاریخ شاعری میں اندازاً دو درجن مثنوی نگار ملتے ہیں اور یہ سلسلہ نواب محمد یار خاں امیر (م ۱۷۷۵ء) کی مثنویات "در شدت برسات" اور "در کثرت مگس" سے شروع ہو کر شیام موہن لال جگر بریلوی (م ۱۹۷۶ء) کی مثنویات پر ختم ہوتا ہے جن میں مثنوی "پیام ساوتری" گراں قدر ہے۔ انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں امیر الدین آزاد (م ۱۸۶۷-۶۸ء) احمد حسن خاں جوش (م ۱۸۸۶ء) نیاز احمد خاں ہوش (م ۱۸۹۲ء) جوالا شنکر امیر۔ حسن رضا خاں حسن (م ۱۹۰۸ء) ناصر الدین احمد ناصر (م ۱۹۰۸ء) سید مہربان علی فرحاں (م ۱۸۹۴ء) اور حضور احمد خاں آثم (م ۱۹۴۴ء) بڑے مثنوی نگار تھے۔ حسن کی مثنوی "وسائل بخشش" اور ناصر کی مثنوی "پیکر حشر و نشر" نے مذہبی رجحان کی نشاندہی کی۔ اسی طرح جوالا شنکر امیر نے کتھا ست نرائن کو اپنی مثنوی "دافع العذاب" میں نظم کیا۔ فرحاں نے بچوں کی دلبستگی کے لیے تین مزاحیہ مثنویات مسمی "قصہ قاضی جونپور"۔ "احمق نامہ" اور "آئینہ رونما (حجام نامہ)" تالیف کیں جو بہت مقبول ہوئیں۔ عشقیہ مثنویات کے سلسلے میں جوش کی مثنوی فسانۂ جوش۔ آزاد کی مثنوی "عشق صادق" ہوش کی مثنوی "ترانۂ ہوش"

اور حضور احمد خاں آثمؔ کی مثنوی "ذائقہ عشق" نے شہرت پائی۔ اس طرح مثنوی پیکرِ حسن کے مولف کے سامنے مقامی ہمعصر شعرا کی مثنویات بھی تھیں اور انکے ساتھ ہی مذہبی مزاحیہ اور عشقیہ میلانات کے نمونے بھی۔

جہانتک اردو مثنوی کے اسلوب بیان کا تعلق ہے اس کی سمت کا تعین چار برس کے اندر لکھی ہوئی تین مثنویات کے ذریعہ ہوگیا تھا۔ نواب محبت خاں محبتؔ (م ۱۸۰۹ء) کی مثنوی مسمی بہ "یوسف زلیخا" (۱۷۸۲ء) کا تحلیل جذبات عشق پر مبنی نہایت موثر اسلوب میر حسن (م ۱۷۸۶ء) کی مثنوی سحرالبیان (۱۷۸۴ء) کا سلیس اور بامحاورہ اسلوب اور میر ضیاءالدین عبرتؔ (م قیاساً ۱۷۸۸ء) کی ناتمام مثنوی "پدماوت" (جس کو میر غلام علی عشرتؔ بریلوی متوفی ۱۸۲۱ء نے ۱۷۹۶ء میں مکمل کیا) کا اسلوب؛ مثنوی کے ایسے اسالیب تھے جو عہد فردا میں خضر راہ بنے۔ واقعات عشق کی تحلیلِ جذبات اور ثرر فنڈینی، معاشرتی رسوم وغیرہ کی بامحاورہ پیش کش مثنوی کے پائیدار اسلوب کا ذریعہ بنے۔ میر ضیاءالدین عبرتؔ کے طرز نگارش کو دیا شنکر نسیمؔ (م ۱۸۴۳ء) نے مزید فنی بلاغت اور وسعت کے ساتھ اختیار کیا لیکن اس کو پائیداری نہیں ملی۔ دیگر مثنویات میں اس کے اثرات کو جگہ بہ جگہ زیادہ تر محسوس کیا جا سکتا ہے، ایک چلن اور ایک روش کی کیفیت نہیں ملتی۔

مثنوی پیکرِ حسن ۱۸۹۹ء میں تالیف ہوئی تھی۔ اس وقت مثنوی زہر عشق عام لوگوں کے اعصاب پر سوار تھی لہٰذا یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ مثنوی پیکرِ حسن کے مولف نے ایک عشقیہ قصہ نظم کیا اور نئے رجحانات کو منہ نہیں لگایا۔ اس نے اپنی مثنوی کے طرز نگارش پر نظر رکھی اور اس میں کامیاب بھی ہوا۔ اس کی مثنوی واقعاتی جذبات نگاری

بامحاورہ موثر زبان اور تمثیلی و استعاراتی پیکر تراشی کا عمدہ نمونہ ہے۔ مثنوی پیکرِ حسن کے متعلق ضروری معلومات یہ ہیں:

نام مولف کلب حسین نائلؔ۔ تعداد صفحات ایک سو چھپن۔ سائز ۲۲ × ۱۸۔ کاغذ چکنا ولایتی۔ کتابت اور طباعت اعلیٰ۔ مسطر سترہ سطری۔ مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی۔ سال طباعت ۱۸۹۹ء۔ مثنوی کے اشعار کی تعداد دو ہزار پانچ سو اکتالیس مثنوی گمنام اور کمیاب۔

مثنوی پیکرِ حسن کے مولف کے حالات اس طور پر ہیں:

نام کلب حسین۔ تخلص نائلؔ۔ ابن شیخ پیر محمد۔ متولد موضع شیش گڈھ ضلع بریلی۔ تعلیم واجبی۔ موضع شیش گڈھ سے بریلی آیا جہاں اس کی پھوپی زاد بہن نجیبن نے اسکو اپنی سرپرستی میں لیا۔ اس کو نجیبن نے اپنی جائداد کا مختار عام بنایا۔ نجیبن رؤسائے شہر میں بارسوخ تھی جس کی وجہ سے اس کو بھی شناخت کیا گیا اور اس کا شمار بھی بریلی کے امراء میں ہونے لگا۔ اس نے مثنوی پیکرِ حسن میں نجیبن سے اپنی ممنونیت کا اظہار کرتے ہوئے تحریر کیا ہے

التجا ہے مری تہِ دل سے — دے نجات ان کو فکر باطل سے
پرورش جس نے ہے کیا مجکو — مال و زر اپنا دے دیا مجکو
ناز سے پالا ہے نیاز کیا — مجکو مختار ذی مجاز کیا
عمر اور عیش کر عطا ان کو — شاد و آباد رکھ خدا ان کو (ص ۱۷)

کلب حسین نائلؔ نے رؤسائے شہر کی وضع کے مطابق شعراء کی سرپرستی کی اور خود بھی شعر کہنا شروع کیا۔ اس نے امیرؔ مینائی (م ۱۹۰۰ء) کے ایک شاگرد احمد علی۔

خاں عاصی نارنولوی ثم بریلی (م ۱۹۰۱ء) کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ عاصی قاضی عبدالجلیل جنوں بریلوی (م ۱۹۰۰ء) تلمیذ غالب کے خوان کرم کا زلہ ربا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی پیکرِ حسن اس کی اصلاح سے بے نیاز رہی۔ کلب حسین مائل نے تحریر کیا ہے ؎

تھا نہ مجھکو کبھی یہ سان گمان   مثنوی نظم ہو خدا کی شان
کہا دل نے کہ دوسرے کا بار   کون لیتا ہے اپنے سر بیکار
کیوں کہیں جا کے التجا کیجے   کس سے فریاد نارسا کیجے
رہا اصلاح سے کلام مرا   سب کی خدمت میں ہے سلام مرا
مجکو شکوہ نہ کچھ شکایت ہے   ختم القصہ یہ حکایت ہے (ص ۱۵۶)

اس مثنوی کے علاوہ کلب حسین مائل کا دیگر کلام نہیں ملتا۔ ادبی اور غیر ادبی ماخذ اس کے ذکر سے خالی ہیں۔ گلدستوں میں اس کی غزلیات شایع نہیں ہوئیں۔ اسکے ہمعصر شعرا اس سے ناواقف تھے۔ خود مجھے اس کو تلاش کرنے میں بہت وقت لگا۔ اس کی ادبی گمنامی کے دو سبب ہو سکتے ہیں۔ خود اس نے بریلی کے شعرا اور مشاعروں سے اجتناب کیا یا پھر اساتذۂ بریلی نے اس کو منہ نہیں لگایا۔ لہذا یہ بات بھی قیاس میں آتی ہے کہ اس نے مثنوی پیکر حسن اساتذۂ بریلی کو یہ باور کرانے کے لیے تالیف کی کہ خود اس کے استاذ سخن ہونے میں شبہ نہیں کرنا چاہیے۔ اس کے مندرجۂ ذیل اشعار میں رجز کا طور ہے ؎

ہوں میں سلطانِ خسروانِ سخن   میرے قبضے میں ہے جہانِ سخن
وہ سخنور ہوں وہ زباندان ہوں   وقت کا اپنے آج سحباں ہوں (ص ۱۴)

پھر بھی اس کو اپنی حیات میں شہرت نہیں ملی۔ اس کی وفات کے بعد بھی اسکی گمنامی

قائم رہی۔ اگر اتفاقیہ طور پر اس کی مثنوی میرے ہاتھ نہیں لگتی تو معلوم نہیں کب تک اس کو گمنام رہنا پڑتا۔

کلب حسین مائل کی شادی حکیم جمشید علی خاں اختر دہلوی ثم بریلی (م ۱۹۵۱ء) کی بھانجی سے ہوئی تھی۔ یہ وہی جمشید علی خاں اختر ہیں جن کو سہواً غالب کا شاگرد بتایا گیا ہے۔ اس کا صرف ایک لڑکا مسمّٰی مقبول حسین تھا جو مالا ریلوے اسٹیشن (ضلع پیلی بھیت) کے ریل حادثے میں ۲۵ نومبر ۱۹۴۵ء کو فوت ہوا۔ خود کلب حسین مائل کی وفات ۱۸ اپریل ۱۹۱۱ء کو ہوئی تھی۔

کلب حسین مائل نے اپنی زندگی میں ایک شاندار مکان متصل کتب خانہ گلی آریہ سماج بریلی میں تعمیر کرایا تھا جس کا تاریخی نام "منظر حسین" (۱۳۱۸ھ/۱۹۰۰ء) ہے یہ خاندان عقیدۃً اہل سنت والجماعت ہے لیکن محرم الحرام میں عزاداری کے لیے معروف ہوا۔ مذکورہ مکان کے مغربی گوشے میں امام باڑہ ہے جو "نجیبن کا امام باڑہ" کہلاتا ہے اور جو عزاداری کے لیے مشہور ہوا۔ لوگ کلب حسین مائل اور مثنوی پیکر حسن سے ناواقف ہیں لیکن نجیبن اور نجیبن کے امام باڑے کو جانتے ہیں!

کلب حسین مائل کے سامنے کوئی اپنا یا پرایا قصۂ عشق نہیں تھا اور نہ اس نے خود بھی کوئی فطری قصۂ عشق نظم کرنے کی کوشش کی۔ اس نے جدید میلانات سے گریز کر کے قدیم مثنویات کے قصوں کے طرز پر ایک فوق فطرت کہانی نظم کی جس میں انسانوں کے بجائے جن اور تدابیر بشر کے بجائے طلسمات کا دخل تھا۔ سچ پوچھیے تو فوق فطرت امور کتنے ہی خلاف عقل معلوم ہوں بشر کی ابتدائی جبلت ان سے کلیتہً انکار نہیں کر پاتی اور یہی وجہ ہے کہ رومانٹک شاعری میں نیم تاریخی اور دیومالائی عناصر کا

دخل جاری ہے۔ مثنوی پیکر حسن کا قصہ اس طور پر ہے :

مورخان کہن کہتے ہیں کہ ایک شہر جزیرۂ سوسن میں آباد تھا جہاں خواجہ قاسم نام کا ایک جوان اور دولت مند سوداگر رہتا تھا۔ ایک دن خواجہ قاسم جب تفریح کے لیے نکلا تو اس نے ایک آتش فشاں پھٹتے ہوئے دیکھا تھا۔ ایک دن اس کے ملازم نے ایک پریشان حال اجنبی کے متعلق اطلاع دی جس کو اس نے طلب کیا۔ اجنبی کا نام قمر پیکر تھا۔ قمر پیکر نے اپنی کہانی سنائی کہ اس کے مکان کے قریب ایک باغ تھا۔ جہاں وہ سیر کرنے کے لیے ایک دن تنہا گیا۔ اس نے کنج باغ میں ایک پری کی آواز سنی جو اپنا بچہ آہو تلاش کر رہی تھی۔ قمر پیکر پری کو تلاش کرتا ہوا بچۂ آہو کے تعاقب میں گیا اور بالآخر ایک طلسمی شہر میں پہنچ گیا جس کی حاکم وہی پری تھی۔ پری کا نام روشن گہر تھا۔ ایک خواص کے ذریعہ قمر پیکر کی رسائی روشن گہر تک ہو گئی۔ دونوں ایک دوسرے پر مائل ہو کر وصل سے ہمکنار ہوئے۔ کچھ دن عیش و عشرت میں گزارنے کے بعد قمر پیکر کو اپنا وطن یاد آیا۔ اس سے روشن گہر نے واپسی کا وعدہ لے کر اسکو وطن جانے کی اجازت دے دی۔ قمر پیکر نے اپنے وطن واپس ہونے کے بعد حاکم شہر کی لڑکی سے شادی کر لی اور اس کے بہکانے پر ایک عامل کے ذریعہ روشن گہر کے طلسمی محل کو جلا دیا۔ جس وقت روشن گہر اپنے محل میں جل رہی تھی ایک مرد ضعیف محل کی دیوار سے برآمد ہوا اور اس نے عامل کے عمل کو ضایع کر دیا اس کے بعد قمر پیکر اس جگہ بے ہوش ملا جہاں خواجہ قاسم نے آتش فشاں پھٹتے ہوئے دیکھا تھا۔ قمر پیکر اپنی کہانی سنا کر فوت ہو گیا۔

یہ کہانی قدیم مثنویات کے قصوں کے مطابق ہے۔ فوق فطرت عنصر کے ساتھ

بُعد زمان و مکاں کا تخیل بھی نمایاں ہے۔ مثنوی نگار نے اس کہانی کے ذریعہ بشر کی عہد شکنی، عیش کوشی اور بے وفائی کو واضح کیا ہے۔ اس کے مقابلے میں اس نے ایک پری کی وفاداری کو پیش کر کے عورت کے کردار کو بھی عظمت بخشی ہے۔ اس نے یہ تاثر دیا ہے کہ عورت کی حالت زار کا سبب مرد کا ظالمانہ رویہ ہے۔

مثنوی پیکر حسن میں چند کردار ہیں۔ خواجہ قاسم ایک مالدار تاجر ہے اور کہانی میں اس کی حیثیت ایک سامع کی ہے۔ قمر پیکر مثنویات کے ہیرو کی طرح جوان اکلوتا نہم جو عاشق مزاج شاہزادہ ہے جس کی بے وفائی اور سخت دلی کی وجہ سے اسکے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ روشن گہر مثنوی کی ہیروئن ہے جس کو اس کی وفا راس نہیں آئی۔ اس کی معصومیت عشق صادق ایثار اور لرزہ خیز انجام اس سے ہمدردی کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔ بزم آرا ایک جوان شوخ و طرار خواص ہے جس کا عضو عضو پھڑکتا ہے اور جس کی زبان قینچی کی طرح چلتی ہے۔ اردو مثنویات کی تاریخ میں بزم آرا کا کردار امتیازی شان رکھتا ہے۔ ان کرداروں کے علاوہ دیگر کردار برائے نام ہیں اور وہ کہانی کو پیوستہ رکھنے کے لیے ہیں۔

مثنوی پیکر حسن کے جملہ کردار خاص طور پر مرکزی کردار ایک فوق فطرت کہانی میں بشری احساس و جذبے کے حامل ہیں اور یہی وہ خصوصیت ہے جس سے مثنوی کی دلچسپی قائم رہتی ہے۔ چونکہ مثنوی میں ایک قصہ نظم کیا جاتا ہے لہذا واقعہ نگاری کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ حالی نے تو واقعہ نگاری کو قصہ گوئی کے فرائض میں شمار کیا ہے۔ لیکن واقعہ نگاری کے سلسلے میں مثنوی نگار کی افتاد طبع کو پیش نظر رکھنا بھی ضروری ہے کیونکہ اس کے شعری رویے کا انحصار اس کے مدارج احساس پر مبنی ہوتا ہے۔ اس نے

کس واقعہ کو پیش کیا، اس نے واقعہ کی حقیقت کو کس طور پر پیش کیا، اس کا ذاتی رویہ ہے۔ مثلاً مثنوی پیکرِ حسن میں مثنوی نگار نے باغ کے پُر بہار منظر کو مکمل غنائیت کے ساتھ ضرور پیش کیا لیکن مہین پھوار سے جو سبزہ زار پر جوبن آیا اور روئے گل سے گرد و غبار دھلا وہ اس کے اپنے رویے پر مبنی ہے۔ اس کے تصور میں باغ کا وہ منظر زیادہ حسین ہے جب کہ مہین پھوار بھی پڑ رہی ہو۔ مثنوی نگار نے اس منظر کو بھی پُر بہار اسلوب میں پیش کیا ہے

اک چمن زار تھا قریب مکاں   نزہت افزا گل ریاضِ جناں
چل رہی تھی نسیم عنبر بار   پھول دکھلا رہے تھے رنگ بہار
شاخوں پر عندلیب خوش الحاں   لیے منقار میں گل خنداں
پڑھتی تھیں خطبۂ وداعِ خزاں   آمدِ فصلِ گل سے تھیں شاداں
زیرِ گلبن تھے پھول بکھرے ہوئے   نو عروسانِ باغ نکھرے ہوئے
تھا روشِ پٹریوں کا دامن صاف   عارضِ صبح کی طرح شفاف
دفعتاً چھا گئی گھٹا گھنگھور   شور کرنے لگے چکور و مور
لگی چلنے سہانی پروائی   سبزۂ خوش نما میں لہرائی
وجد میں جھومنے لگے اشجار   اور پڑنے لگی مہین پھوار
آگیا سبزہ زار پر جوبن   مسکرانے لگی فضائے چمن
دھل گیا روئے گل سے گرد و غبار   لکھ گیا ہر ورق پہ باغ و بہار
بجلیاں کوندنے لگیں پیہم   بوندیں پڑنے لگیں مگر کم کم
کیا سیرِ چمن نے سودائی   خود تماشا تھا خود تماشائی (ص ۳۸-۳۹)

اسی طرح سراپا نگاری کے وقت مثنوی نگار کی نظر محبوب کے کس کس عضو پر پڑی اور اس نے حسن کو کس طرح محسوس کیا، کیا جذبات بیدار ہوئے، اس کے ذوقِ نظر اور افتادِ طبع پر منحصر ہے۔ مثنوی نگار نے روشن گہر کے حسن کی تعریف کرتے ہوئے تحریر کیا ہے

تھی وہ تاروں میں ماہ کی صورت   پتلیوں میں نگاہ کی صورت

لیکن ایسی جامع تعریف حسن کے ساتھ ہی اس میں لذت پرستی کا رویہ پیدا ہوا یعنی ہے

دل نے چاہا لپٹ کے پیار کروں   عارضِ ماہ وش کا بوسہ لوں

مثنوی پیکرِ حسن میں مثنوی نگار نے ایک موقع پر حسیناؤں کے پورے جھرمٹ کی اس طرح منظر کشی کی ہے:

غیرتِ حور سارے ہم سن ہیں   مست ہیں کھیل کود کے دن ہیں
وہ انیلی حسین و نازک تن   وہ رسیلی نگاہیں الھڑ پن
وہ پری صورتیں قمر رخسار   وہ سجیلی نگاہیں برق نگار
زلفیں بکھری ہوئی دراز دراز   ناگنیں ہیں کہ کرتی ہیں پرواز
سرو قد۔ گلعذار۔ غنچہ دہن   گدگدا گدگدا سڈول بدن
وہ جوانی۔ ابھار وہ کم کم   آنے والے شباب کا عالم
گر فرشتہ بھی اک نظر دیکھے   یہ تمنا ہو، عمر بھر دیکھے (ص ۶۰)

یہاں مثنوی نگار کے قلم نے آلتِ سنگتراش کا کام کیا ہے۔ قاری کی چشمِ تصور میں ہندوستان کی قدیم تہذیب کے وہ قطار در قطار اصنام ابھرنے لگتے ہیں جو مناور میں

حسین پیکروں اور بھادوں کے ساتھ استادہ ہیں۔

واقعہ کی حقیقت کا اظہار حقیقی جذبات نگاری سے بھی ہوتا ہے جو ایک مشکل فن ہے کیونکہ اس کا تعلق خارجی منظر سے نہیں ہے۔ شاعر کو خود اپنے مخاطب کی طرح محسوس کرنا اور سوچنا پڑتا ہے مثلاً مثنوی پیکر حسن میں واقعہ صرف اتنا ہے کہ قمر پیکر کو بعد وصل بزم آرا سوئے حمام لے جاتی ہے اور اپنی عادت کے مطابق یہ شرارت آمیز گفتگو کرتی ہے ؎

پالیا شاید آپ نے آہو   چہرہ بشاش دل پہ ہے قابو
رنگ نکھرا ہوا ہے جوبن کا   پانی ڈھلکا ہے چشم پُر فن کا
ہم سے رُخ بھی نہیں ملاتے ہو   نیچی نظروں میں مسکراتے ہو
یوں طبیعت بحال تھی نہ کبھی   یہ نزاکت کی چال تھی نہ کبھی
خم گردن میں یہ حجاب نہ تھا   بانکپن میں کوئی جواب نہ تھا
یہ سخن سن کے جی میں شرما کے   ہو کے ہمراہ بزم آرا کے
سوئے حمام میں روانہ ہوا   میری جانب رُخ زمانہ ہوا (ص ۹۴)

ان اشعار میں بزم آرا کی شوخی، طرحداری اور حسب موقع طنز ملیح واقعاتی شگفتہ اور پُر لطف ہے۔

مثنوی پیکر حسن میں واقعاتی جذبات نگاری کی مثالیں اکثر و بیشتر ملتی ہیں۔ یہاں صرف دو مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ پہلی مثال کا تعلق اس موقع سے ہے جب قمر پیکر اپنے وطن کو روانہ ہوتا ہے اور روشن گہر اس کو وداع کرتی ہے۔ ان اشعار سے ایک باوفا عورت کے جذبات کی ترجمانی ہوتی ہے ؎

پھر مرا ہاتھ، ہاتھ میں لے کر   یوں وہ کہنے لگی بہ دیدہ تر

پھر مرے دل میں ہوک اٹھتی ہے   آہ سوزاں جگر میں گھٹتی ہے
دیکھو اے بے وفا۔ وفا کرنا   نہ جفا۔ بانی جفا کرنا
مجکو جاناں۔ نہ بھول جانا تم   ٹھیک وعدے پہ اپنے آنا تم
میری صورت کو دیکھ لو تم پھر   میری حالت کو دیکھ لو تم پھر
دیر ہوگی اگر، خدا کی قسم   پھر قیامت ہی میں ملیں گے ہم
پیٹھ جیسی دکھا کے جاتے ہو   گر خدا چاہتا ہے۔ آتے ہو (ص ۹۶)

لیکن قمر پیکر کی واپسی روشن گہر کو نذر آتش کرنے کے لیے ہوئی۔ قمر پیکر نے عامل کی مدد سے تمام کارخانہ طلسم کو جلا دیا۔ روشن گہر نے قمر پیکر کے روبرو جلتے وقت جو کہا اس میں دکھ اور پچھتاوا ہے۔ ساتھ ہی اپنی وفا کا بدستور احساس ہے کہ اس کی جان اپنے محبوب کے سامنے سے رخصت ہو رہی ہے حالانکہ وہ انسان کی شکل میں حیوان ہے ؎

رحم کر میری نوجوانی پر   رحم کر میری زندگانی پر
میں نے افسوس کیا برائی کی   نعمتیں دیں تجھے۔ خدائی کی
سلطنت تجھ کو ہائے دی اپنی   پیاری عصمت ترے حوالے کی
کیوں مٹاتا ہے بے سبب مجکو   نہ جلا بانیٔ غضب مجکو
خاک سے مجھ مریض الفت کی   آئے گی بو، تیری محبت کی
نہ جلا مجکو اے بت کم سن   میں نے دیکھے نہیں بہار کے دن
روح تیری نہ چین پائے گی   بے کسی میری رنگ لائے گی
کر چلی نذر میں جوانی کو   ہے سلام اس جہان فانی کو

آتش ہجر میں حسین اکثر — جلتے رہتے ہیں یوں تو آٹھ پہر
دل تو جلتا ہے گھر نہیں جلتے — شمع سوزاں سے پر نہیں جلتے
روبرو تیرے، میری جاں نکلے — منہ سے ممکن نہیں فغاں نکلے
جانے کس قسم کا ہے تو انساں — شکل انساں میں ہے، یا حیواں (ص ۱۵۲)

واقعاتی جذبات نگاری کے علاوہ مثنوی پیکرِ حسن میں کوٹھی اور بازار کا بھی بیان ہے۔ مثنوی نگار کے عہد شعور میں بریلی کی قدیم اور تاریخی بستی میں زمینداروں کی عالی شان مرصع کوٹھیاں بھی تھیں اور بازار بھی۔ مثنوی نگار کی اپنی کوٹھی بازار میں تھی۔ شاید ان کوٹھیوں اور بازاروں کی تصویریں شعری تجربے سے گزرنے کے بعد جزو مثنوی بن گئیں۔ بہر نوع کوٹھی اور بازار کی مرقع نگاری میں اس عصر کے جاگیر دارانہ نظام کی معاشرتی جھلک ملتی ہے۔ جاگیر دارانہ نظام حیات میں ہی معمولی واقعات کو ایک حادثے کی طرح سمجھا اور برتا جاتا تھا۔ مثنوی نگار نے اس موقع پر بھی جو منظر پیش کیا وہ اصل کے مطابق تھا۔ مثلاً جب قمر پیکر بے ہوش ہو جاتا ہے تو اس کو ہوش میں لانے کے لیے جو تدابیر اختیار کی گئیں وہ نصف صدی قبل تک بڑے گھرانوں میں عام طور پر مروج تھیں:

پھول بیلے کے لاتی ہے کوئی — عطر فتنہ سنگھاتی ہے کوئی
پنکھیا خس کی کوئی جھلتی ہے — کوئی عطر گلاب ملتی ہے
تلوے سہلا رہی ہے کوئی نگار — سورہ جن کی ہے کہیں تکرار
کوئی کیوڑے کے چھینٹے دیتی ہے — اور کوئی بلائیں لیتی ہے
کوئی کہتی ہے کچھ نہ غم کیجے — آیۃ الکرسی پڑھ کے دم کیجے

کوئی کہتی ہے سرد پانی منگاؤ — یہ غبار سفر تو منہ سے دھلاؤ
لخلخہ ڈھونڈ کر کوئی لائی — کی غرض سب نے عقل آرائی (ص ۵۰)

اب یہ تدابیر تو اختیار نہیں کی جاتی ہیں کیونکہ ڈاکٹروں کی کمی نہیں ہے لیکن انسان کا جن و آسیب سے خوف اور انسانی صحت پر ان کا اثر انداز ہونے کا توہم ہنوز برقرار ہے۔ سورۂ جن اور آیۃ الکرسی پڑھ کر بے ہوش انسان پر دم کرنے کی تدبیر بدستور اختیار کی جاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مثنوی نگار نے مثنوی پیکرِ حسن میں واقعہ نگاری کے فرض کو موقع و محل اور فطرت انسانی کو ذہن نشین کر کے بہ حسن و خوبی ادا کیا اور اس جہت سے یہ مثنوی مکمل نظر آتی ہے۔

کلب حسن مائل نے بریلی کی تاریخ شاعری کے عہد زریں میں اپنی شاعری کا آغاز کیا تھا۔ تلامذہ غالب و مومن، داغ و امیر اور مظفر علی خاں اسیر و خواجہ حیدر علی آتش بریلی کی فضائے شاعری پر چھائے ہوئے تھے۔ انکے اپنے شاگردوں کی بھی کثرت تھی۔ نہ مشاعروں کی کمی تھی اور نہ گلدستوں کی۔ اس عہد کے ایک شاعر برج موہن لال خمار بریلوی نے بریلی کے عروج شاعری کو پیش نظر رکھکر لکھا تھا۔

لکھنؤ کیوں نہ بریلی کو کہیں ان روزوں — اب تو سرسبز یہاں باغ سخن دیکھتے ہیں

ہر چند اساتذہ بریلی نے ہر صنف شاعری میں طبع آزمائی کی لیکن ان کو شہرت غزل کے اسلوب سے ملی جس کا استاذ کلب حسین مائل نہیں تھا۔ لہٰذا اس نے بریلی کے اس عہد زریں میں اپنے سخن کا لوہا منوانے کے لیے مثنوی پیکرِ حسن تحریر کی اور اپنی تمام صلاحیت اس کے طرز نگارش پر صرف کر دی۔ یہ اس کی شعوری کوشش تھی۔ اس نے پیکرِ حسن

کے طرزِ نگارش کے لیے جو باتیں ذہن میں رکھیں وہ اس کے ہی الفاظ میں مندرجہ ذیل ہیں

چلبلی بندشیں ہوں، رنگ نئے شستہ ترکیب کے ہوں ڈھنگ نئے

فقرہ فقرہ ہو گوہرِ و اختر حسن الفاظ ہو پری پیکر

ہو نرالی ادا فصاحت کی پوری تصویر ہو بلاغت کی

وہ دکھا حسن داستانِ سخن خود سخن بولے۔ ہے یہ جانِ سخن

میرے آگے زباں کا دعوی کیا شوکتِ اردوئے معلی کیا

دمِ تحریر یہ خیال رہے حسن معنی کی دیکھ بھال رہے

الغرض ایسی داستاں ہو رقم شورِ محشر بنے صریرِ قلم

سر کو سودا ہو زلفِ جاناں کا سلسلہ ہو جنوں کے ساماں کا

ہو اچھوتی زباں کہانی کی دھوم ہو تیری لن ترانی کی (ص ۱۴)

مثنوی پیکرِ حسن کے جمیع مطالعے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی نگار کا رجحان حسن الفاظ، فقروں کی آب و تاب اور حسن خیزی کی طرف ہے۔ اس نے سلیس الفاظ کا جادو جگایا ہے۔ اس نے کسی موقع پر تخیل طرازی بھی کی تو واقعاتی حقیقت کا بھرم رکھا۔ اس کی مثنوی میں ایک خاص بات یہ نظر آتی ہے کہ شعر کا مصرعہ ثانی تمثیلی و استعاراتی اسلوب میں ہوتا ہے اور اپنے بے ساختہ پن کی داد چاہتا ہے۔ مثلاً

آگیا کیا تمھیں خیال اس وقت ہو گئے بدر سے ہلال اس وقت

پھر طبیعت کمال گھبرائی زلفِ شب تا کمر لٹک آئی

ست۔ مست شراب ہو جائیں شعلہ رو۔ آفتاب ہو جائیں

زرد رنگت ہے سبز بختوں کی ڈالیاں جھک گئیں درختوں کی

سوزِ غم چہرہ سے نمایاں ہے قدِ رعنا پہ کیوں چراغاں ہے

سارے احباب نے کیے جلسے پر نکالے پری نے بوتل سے

اس کو دشتِ عدم دکھاؤں ابھی اس کا گھر دھوپ میں بساؤں ابھی

یہ حناہائے رنگ لائے گی آگ پانی میں یہ لگائے گی

تیرے فرمان سے اگر ہٹ جائے ورقِ آسماں ابھی پھٹ جائے

ناز و غمزہ فروخت ہوتا ہے گلِ خورشید سوخت ہوتا ہے

پہلے تو ہو گئی سکوت میں وہ آئی برجِ حمل سے حوت میں وہ

ان اشعار سے مثنوی نگار کی ذہانت اور ندرت کا احساس ہوتا ہے۔ مثنوی پیکرِ حسن کے اس اسلوب نے بھی قاری کی دلچسپی کو قائم رکھا ہے۔ مثنوی پیکرِ حسن میں جذباتی حقیقت نگاری اور سلاست بیان اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ مثنوی کے بعض اشعار کو دورانِ گفتگو اور مکاتبت میں برمحل استعمال کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً

رنج و راحت ہے ہر بشر کے لیے مجھے رونا ہے عمر بھر کے لیے

اور پھر صبح و شام ہوتی ہے یہاں تُو کی تمام ہوتی ہے

میرا غم اور کا سا غم بھی نہیں کسی صورت سے ہوتا کم بھی نہیں

ہائے مجکو یہ ہے جنوں کیسا کیا میں کہتا تھا کہہ رہا ہوں کیا

بات پر لوگ اپنی مرتے ہیں کہتے ہیں جو زباں سے۔ کرتے ہیں

اب جو پھر کر وطن کو آئیں گے ناؤ ہم خضر کی چڑھائیں گے

کیوں یہ عالم کا ہے چلن بگڑا ہر ادا بگڑی بانکپن بگڑا

جان پر بھی مری اگر بن جائے تو بھی شکوہ ترا زباں پہ نہ آئے

سرنوشتِ قضا مٹائے کون | روزِ بد کی بلا اٹھائے کون
کی خدا نے ہماری سنوائی | ٹل گئی سر پہ یہ بلا آئی
تم تو صاحب عجیب ہو انساں | کبھی ایران ہو کبھی توران
پھر شکایت کسی کی کیا کیجے | اپنی تقدیر کا گلہ کیجے
زندگی کا مزا نہیں مجکو | ہائے لیتی نہیں قضا مجکو

دراصل مثنوی پیکرِ حسن کا معیارِ سخن مثنویات سابقہ کی طرح اس کے اسلوب میں پوشیدہ ہے۔ مثنوی پیکرِ حسن میں جہاں جدید رجحانات اور جدید لفظیت سے شغف کا ثبوت نہیں ملتا وہاں لذت پرستی اور مبتذل الفاظ و لہجے سے گریز کا رجحان ملتا ہے اس کے طرزِ بیان میں غنائیت اور شگفتگی ہے۔ اس کی سلیس، بامحاورہ اور عام فہم زبان میں جذبات کی حرارت، واقعیت اور مثنوی نگار کی ذہانت ملتی ہے۔ اس کے برجستہ اور برمحل اشعار میں نیاپن اور ندرت محسوس ہوتی ہے۔ مثنویات سسی پنوں۔ سحرالبیان۔ خواب و خیال۔ گلزار نسیم۔ طلسم الفت اور زہر عشق کے اسالیب کے ارتقائی سفر میں مثنوی پیکرِ حسن کا اسلوب بھی سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے جس کی بازیافت سے وہ خلا پُر ہوتا نظر آتا ہے جو نواب مرزا شوق کی مثنوی زہر عشق اور جوالا پرشاد برقؔ کی مثنوی بہار کی درمیانی مدت میں پیدا ہوا تھا۔

مثنوی پیکرِ حسن کی دوبارہ اشاعت اور اردو مثنویات کی تاریخ میں اس کی شمولیت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ اس پر توجہ کی جانی چاہیے۔

معارف کی ڈاک

(۱)

۲۹۵۔ بلاک۔ ۸/۷ سی پی برار سوسائٹی۔ کراچی۔

مولانائے محترم زاد فضلکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی، ماہ صیام مبارک ہو، ہمارے محکمۂ ڈاک نے اس مرتبہ ایک ایک روپے کے ٹکٹ علامہ سید سلیمان ندویؒ اور علامہ شبلی نعمانیؒ کی یادگار کے طور پر چھاپے ہیں، آپ کے ملاحظہ کے لیے ملفوف کر رہا ہوں۔

بابری مسجد کے سلسلہ میں سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب مرحوم نے علمی جہاد کا جو حق ادا کیا تھا جنوری ۱۹۹۳ء کے آپ کے تحریر فرمودہ شذرات اسکا اختتامی حصہ ہیں، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور نصرت الٰہی شامل حال ہو جائے۔

اس ناچیز کی تصنیف "رموز سورۂ یوسف" اب تک آپ کی توجہ سے محروم ہے، معارف میں تبصرہ نہ آسکا، الحمد للہ یہاں موسم خوشگوار ہے، روزے سہل گذر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ماہ صیام کی برکات و تجلیات سے بہرہ ور رکھے۔ والسلام

ناچیز غلام محمد

(۲)

اے، ۲۵۔ گورنمنٹ کوارٹرس، گاندھی نگر، جموں

۱۷ مارچ ۹۳ء

محبِ گرامی قدر، آداب

میں پندرہ بیس دن مسلسل سفر میں رہنے کے بعد پرسوں ہی گھر واپس آیا ہوں۔ ڈاک میں "معارف" کا تازہ شمارہ موجود تھا۔

آپ نے "شذرات" میں اس خاکسار کا ذکر کیا ہے۔ "معارف" نے ہمیشہ میرے چھوٹے چھوٹے علمی اور ادبی کام کو قدردانی کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ "معارف" میں اپنا ذکر دیکھتا ہوں تو اپنی بے علمی کے پیش نظر شرمندہ ہوکر رہ جاتا ہوں۔ شاہ معین الدین ندوی مرحوم اور سید صباح الدین عبد الرحمن مرحوم کے زمانے سے میں "معارف" کا ممنونِ احسان چلا آرہا ہوں۔ یہ خداوند کریم کا کرم ہے۔ وہی سورۂ رحمن والی بات ہے۔

میں نے شاید ایک مدت سے "معارف" کے لیے کچھ نہیں لکھا۔ ان دنوں "بابری مسجد" کے عنوان سے ایک نظم ہوئی ہے۔ نظم تو، دسمبر ۹۲ء ہی کو ہوگئی تھی۔ مسلسل سفر پیش آتے رہے۔ یہ نظم کاغذات میں دب گئی۔ اس کی نقل اس خط کے ساتھ منسلک ہے، پسند ہو تو معارف کے لیے حاضر ہے۔

پیچھے مذکورہ سفر کے متعلق اصل بات تو میں نے لکھی ہی نہیں۔ جنوبی ہند کا یہ سفر جناب عزیز قریشی چیرمین سنٹرل اردو یونی ورسٹی کی معیت میں تھا، اس بات کا جائزہ لینے کے لیے کہ یونی ورسٹی کا صدر دفتر کہاں قائم کیا جائے۔ ابھی ہندوستان کے بعض اور شہروں کا سفر باقی ہے۔ آئندہ ماہ انشاء اللہ یہ تمام سفر مکمل ہو جائینگے۔ اس سفر کی رپورٹ کمیٹی کو پیش کر دی جائے گی اور کمیٹی اپنی سفارش حکومت ہند کو بھیج دے گی۔ خدا نے چاہا تو بہت جلد مجوزہ اردو یونی ورسٹی کے قیام کی خبر آپ اخبارات میں پڑھ لیں گے۔ خدا کرے آپ ہر طرح خیریت سے ہوں۔

نیاز مند: جگن ناتھ آزاد

(۳)

سی۔ ۱۳۳۹۔ اندرا نگر۔ لکھنؤ۔

۱۳؍۳؍۹۳ء

برادرم اصلاحی صاحب! سلام مسنون۔

معارف کے شمارے نظر سے گذرتے ہیں اور طبیعت خوش ہوتی ہے کہ آپ نے اپنے پیش روؤں کے علمی اور ادبی وقار کو نہ صرف برقرار رکھا ہے بلکہ حالات حاضرہ کے پس منظر میں "شذرات" کو حق گوئی اور بے باکی کا مظہر بھی بنایا ہے۔ سال رواں کے سبھی اداریے ہمارے عہد کی تاریخی دستاویز مرتب کرتے ہیں اور ان میں مسلمانوں کے جذبات و احساسات کی بڑی ہی سچی ترجمانی آپ کے قلم سے ہوئی ہے۔ فروری کے شمارہ میں جناب رام لعل نابھوی کا مضمون "عربی فارسی اردو میں سکھ گورو اور سکھ پوتھیاں" خاصہ کی چیز ہے اور کتابیات کی جو فہرست انھوں نے مرتب کی ہے وہ انھیں جیسے محقق کے بس کی بات ہے۔

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ لکھنؤ آئیے تو (۳۸۲۴۳۰) پر مجھے ٹیلیفون کیجئے۔ میں حاضر ہو جاؤں گا۔

نیاز مند

ملک زادہ منظور احمد

ادبیات

بابری مسجد

از پروفیسر جگن ناتھ آزاد

۵ دسمبر کو میں جموں سے دہلی روانہ ہوا، دوسرے دن ۶ دسمبر کو اردو یونیورسٹی کمیٹی کی میٹنگ میں شرکت کے لیے۔ شام کا سفر تھا۔ طیارے میں ایک ہمسفر نے بتایا کہ بابری مسجد کے ایک گنبد کو گرا دیا گیا ہے۔ میں نے کہا کہ آج دوپہر تک یعنی روانگی کے وقت تک تو ایسی کوئی خبر نہیں تھی۔ اس نے کہا بی بی سی نے اطلاع دی ہے۔ میں درد و غم کے طوفان میں ڈوب گیا اور اسی وقت اس نظم کی ابتدا ہوئی۔ صرف ابتدا کے تین بند ہوئے تھے کہ طیارہ دہلی پہنچ گیا۔ جب میں اپنی قیام گاہ پر یعنی بیٹے کے گھر میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ ساری مسجد منہدم کی جا چکی ہے۔ نظم کا باقی حصہ اس اطلاع کے بعد مکمل ہوا۔ اسی لیے یہ نظم دو الگ الگ حصوں میں منقسم ہو گئی ہے۔ (آزاد)

(۱)

یہ تو نے ہند کی حرمت کے آئینے کو توڑا ہے
خبر بھی ہے تجھے مسجد کا گنبد توڑنے والے؟
ہمارے دل کو توڑا ہے عمارت کو نہیں توڑا
خباثت کی بھی حد ہوتی ہے اے حد توڑنے والے!

تمہارے اس فعل سے اسلام کا تو کچھ نہیں بگڑا
مگر گھونپا ہے خنجر تو نے ہندو دھرم کے دل میں
ادھر ہندوستان کا تو نے چہرہ مسخ کر ڈالا
اُدھر بوئے ہیں کانٹے تو نے اسکی راہِ منزل میں

تجھے کچھ بھی خبر اسکی نہیں اے بدنصیب انساں
کہ ہندو قوم کیا ہے اور اسکی آتما کیا ہے
نہیں ہے دھرم وہ ہرگز جسے تو دھرم کہتا ہے
تجھے کیا علم کیا ہے آتما، پرماتما کیا ہے

(۲)

خبر کل تک بس اتنی تھی کہ گنبد ایک ٹوٹا ہے
کھلی اب بات مسجد کا نہیں چھوڑا نشاں باقی
وہ تہذیبی تسلسل جو تھا جاری چار صدیوں سے
تو سمجھا ہے نہ رہ پائے گی اسکی داستاں باقی؟

میں اک گنبد کو روتا تھا مگر اب یہ کھلا مجھ پر
گرا ڈالا ہے اس ساری عبادت گاہ کو تو نے
دیا تھا اک دلِ آگاہ تجھ کو دینے والے نے
یہ کس رستے پہ ڈالا ہے دلِ آگاہ کو تو نے!

خدا کا گھر ہے مندر بھی خدا کا گھر ہے مسجد بھی
مجھے تو میرے ہندو دھرم نے بس یہ سکھایا ہے
نہیں ہے دھرم وہ ہرگز، فقط اندھی سیاست ہے
تجھے تیرا یہ درسِ شیطنت جس نے پڑھایا ہے

مروت جس کو کہتے ہیں، مودت جس کو کہتے ہیں
یہ مسجد اس مروت اس مودت کی علامت تھی
اسی کے ساتھ تو اک اپنا مندر بھی بنا لیتا
وہی تیرا بڑپّن تھا وہی تیری کرامت تھی

خدا کے گھر کو جب تو منہدم کرنے کو نکلا تھا
خدا جانے ترے دل میں خیالِ خام کیا ہو گا
مکافاتِ عمل کہتے ہیں جس کو اک حقیقت ہے
شقی القلب کیا کہیے ترا انجام کیا ہو گا

یہ مسجد آج بھی زندہ ہے اہلِ دل کے سینوں میں
خبر بھی ہے تجھے، مسجد کا پیکر توڑنے والے
ابھی یہ سرزمیں خالی نہیں ہے نیک بندوں سے
ابھی موجود ہیں ٹوٹے ہوئے دل جوڑنے والے

باب التقریظ والانتقاد

رموز سورۂ یوسف

از مولانا ڈاکٹر غلام محمد صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۱۰۰، مع خوبصورت ڈسک کور، قیمت تحریر نہیں، پتہ: ادارۂ نشر المعارف شہرستان بلڈنگ (پہلی منزل)، بالمقابل ایس۔ ایم۔ آرٹس کالج، اسٹریچن روڈ۔ کراچی ۱ (پاکستان)

مولانا غلام محمد صاحب کو اللہ تعالیٰ نے ان کے مرشد عالی مقام حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی طرح علم وعرفان اور شریعت وطریقت کا جامع بنایا ہے اور وہ انہی کی طرح علمی وعرفانی دولت لٹا رہے ہیں، حضرت سید صاحبؒ کی طرح ان کے مرید باصفا کو بھی قران مجید کے مطالعہ سے شغف ہے، یہ کتاب اسی شغف اور مطالعہ قرآن سے دلچسپی کا نتیجہ ہے، اس میں سورۂ یوسف کے رموز، فوائد ونکات اور عبرت وموعظت سے پُر باتوں کو قلمبند کیا گیا ہے۔

مصنف کو سورۂ انفال اور سورۂ یوسف کے فوائد ونکات قلمبند کرنے کا خیال عرصہ سے اس لیے تھا کہ اول الذکر سورہ میں جہاد بالسیف کی ترغیب وتاکید ہے۔ اور موخر الذکر میں جہاد بالنفس کی اہمیت وافادیت کو پیغمبری خانوادہ کے مثالی کردار میں واضح کیا گیا ہے لیکن جہاد بالسیف وقت وشرائط کے جمع ہونے ہی پر فرض ہوتا ہے اور جہاد بالنفس کا فریضہ مسلمان مرد وعورت پیر وجوان پر ہر گھڑی عائد ہوتا ہے۔ سورۂ یوسف کے فوائد پہلے تحریر کرنے کا سبب یہی ہے۔

یہ تجزیہ ہی قرآنی معارف وحقائق سے مصنف کی دلچسپی اور واقفیت کا ثبوت ہے اور اسی سے کتاب کی نوعیت اور قدر وقیمت کا بھی اندازہ بڑی حد تک ہوجاتا ہے، مصنف کے حسن مذاق اور قرآن مجید کا حقیقت شناس ہونے کا ثبوت یہ بھی ہے کہ انھوں نے سورۂ یوسف کی غیر قرآنی تفصیلات کو نظر انداز کردیا ہے کیونکہ غیر قرآنی تفصیلات ہی نے اس سورہ کو حسن وعشق کی داستان بنا دیا ہے۔ اس لیے فاضل مصنف اگر روایات میں پڑے بھی ہیں تو بقول ان کے صرف مستند روایات میں؛ انھوں نے سورۂ یوسف کے چار اجزا کیے ہیں، پہلا جز افتتاحیہ یا تمہید ہے، دوسرے جز میں قصۂ یوسف کے حصہ اول یعنی حضرت یوسفؑ کے دور ابتلا سے متعلق قرآنی بیان کو پیش کیا ہے، تیسرے جز میں حضرت یوسفؑ کی زندگی کے دوسرے حصہ یعنی اعزاز واکرام کی سرگذشت بیان ہوئی ہے اور آخری جز میں سورہ کے خاتمہ کی آیتوں پر بحث کی ہے۔ اس سلسلہ کی آیتوں پر گفتگو کے ضمن میں احوالِ یوسفی اور احوالِ محمدی میں مناسبت کے متعدد لطیف پہلو بیان ہوئے ہیں۔

مصنف کے رمز آشنائے قرآن ہونے کا اندازہ مثالوں کے بغیر نہیں کیا جاسکتا ہے، وہ بسم اللہ کے سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ اللہ کی ذات کے بجائے اس کے نام سے اس لیے ابتدا ہے کہ اس کی ذات حواس، عقل اور فکر کی پہنچ سے تمام تر دور، بے چون وبے چگون، بے کیف وکم اور غیب الغیب ہے، اللہ کی پہچان اور معرفت کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ اس کے صرف نام سے ابتدا کرکے مسمیٰ کی معرفت تک پہنچا جائے اس لیے نہ صرف بسم اللہ بلکہ سارے قرآن حکیم میں مسمیٰ کے اسم (اللہ) ہی کے کثرتِ ذکر کی تاکید آئی ہے۔ (ص۹)

سورۂ یوسف کے آغاز ہی میں کہا گیا ہے کہ إِنَّا أَنزَلْنَاهُ (ہم نے اس کو اتارا ہے) فاضل مصنف کی نکتہ شناس نگاہ میں یہ قرآن کی عظمت و حقانیت کا اعلان ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ جو کچھ اس میں ہے وہ حق ہے اور جو کچھ اس کے باہر ہے (اسرائیلیات اور قصے) سب بے سند اور غلط ہے۔ (ص ۱۳)

حضرت یوسفؑ کے بھائی ان کو تاریک کنوئیں میں ڈال کر ان کی قمیص پر جھوٹا خون لگا کر جب حضرت یعقوبؑ کے پاس شام کو روتے ہوئے آئے تو یہ کہنے کے ساتھ کہ "ابا ہم سب تو آپس میں دوڑنے میں لگ گئے اور یوسفؑ کو ہم نے اپنے سامان کے پاس چھوڑ دیا، بس ایک بھیڑیا ان کو کھا گیا" یہ بھی کہا کہ وَمَا أَنتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صَادِقِينَ (اور آپ تو ہمارا کاہے کو یقین کرنے لگے گو ہم کیسے ہی سچے ہوں) مصنف کا نکتہ رس ذہن اسے ان کے دل کا چور قرار دیتا ہے اور پھر یہ نکتہ آرائی بھی کرتا ہے کہ "ایک جھوٹ سو جھوٹ پیدا کر کے بھی یقین فراہم نہیں کر سکتا اور کیسے فراہم کر سکے کہ جھوٹے کا دل یقین سے محروم ہے"۔

قرآن مجید نے کہا ہے "یوسف اور ان کے بھائی کے واقعات میں پوچھنے والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں" فاضل مصنف نے ان نشانیوں کی تشریح میں خوب ہی نکتے اور فوائد تحریر کیے ہیں (ص ۱۸) اسی طرح "صبر جمیل" اور "تاویل الاحادیث" کے مفہوم کی وضاحت میں بھی نکات بیان کیے ہیں (ص ۲۴ و ص ۲۶)

عربیت اور نحوی نکات سے بھی کتاب خالی نہیں ہے۔ مثلاً وَرَاوَدَتْهُ الَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا عَن نَّفْسِهِ (اور جس عورت کے گھر میں یوسفؑ رہتے تھے وہ ان سے اپنا مطلب حاصل کرنے کو ان کو پھسلانے لگی) کے متعلق بتاتے ہیں کہ یہاں عورت

کا نام نہ لینا تحقیر کے لیے ہے (ص ۲۸)

وَكَذَٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوءَ وَالْفَحْشَاءَ کے سلسلہ میں رقمطراز ہیں "یہ نہیں فرمایا کہ حضرت یوسفؑ کو گناہ سے دور رکھیں بلکہ فرما رہے ہیں کہ گناہوں کو ان سے دور رکھیں یعنی یوسفؑ تو اپنی شان نبوت کی وجہ سے گناہوں سے ہٹے ہوئے تھے ہی البتہ چونکہ برائی اور بے حیائی نے ان کو گھیر لیا تھا اس لیے اس جال کو توڑ دیا" (ص ۳۱)

مصنف کا اصل ذوق عرفانی ہے اس لیے سلوک و تصوف کے فوائد و رموز بڑی دلچسپی اور لذت سے بیان کرتے ہیں اور وہ عموماً حضرت تھانویؒ اور دوسرے اکابر عرفا کے افادات ہوتے ہیں، ان نکتوں کے ضمن میں مولانائے روم اور دوسرے صاحب دل شعرا کے برمحل عارفانہ اشعار بھی دیے ہیں، مثالوں کے لیے اصل کتاب دیکھنی چاہیے۔

کہیں کہیں اشکالات و ایرادات ذکر کر کے ان کے تشفی بخش جواب دیے ہیں، ایک ہی آیت کی تفسیر میں عموماً مفسرین نے متعدد احتمالات و اقوال بیان کیے ہیں جو کہیں کہیں اس قدر الجھے ہوتے ہیں کہ مرجح قول کا پتہ لگانا دشوار ہوتا ہے فاضل مصنف نے اس طرح کے موقع پر اپنے انداز بیان سے مرجح قول کو نمایاں کر دیا ہے۔ انھوں نے خود بتایا ہے کہ اس کتاب کا مقصد عرفی تفسیر لکھنا نہیں ہے اس لیے اس میں عام تفسیری مباحث سے کم تعرض کیا گیا ہے البتہ پوری سورہ کا جو ترجمہ کیا ہے وہ مطلب خیز اور ایچ پیچ سے خالی ہے۔

کتاب کی خوبیوں کا صحیح اندازہ مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے، ایک مختصر تبصرہ میں

سب کا احاطہ مشکل ہے لیکن مکمل احتیاط و کوشش کے باوجود کوئی کسر بھی رہ جاتی ہے۔

۱۔ حضرت یوسف کے قصہ کو احسن القصص (سب سے عمدہ قصہ) سمجھا جاتا ہے جو غلط نہیں ہے لیکن اس کی کوئی دلیل نہ اس سورہ میں ہے اور نہ پورے قرآن مجید میں، اس نے نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ (۳) کہا ہے۔ واضح رہے کہ قَصَص مصدر ہے اور احسن القَصَص ترکیب میں مفعول مطلق واقع ہے نہ کہ مفعول بہ، رہا قصہ تو اسکی جمع قِصَص ہے۔ مصنف نے تشریح میں دونوں کو خلط ملط کر دیا ہے (ص۱۳ و ۱۴) اور ترجمہ یہ کیا ہے کہ "ہم آپ سے ایک بڑا عمدہ قصہ بیان کرتے ہیں" اسی طرح آخری آیت لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ الخ کا ترجمہ "ان کے قصے میں" کیا ہے، اس سے خیال ہوتا ہے کہ وہ قصص کو قصہ کی جمع سمجھے ہیں۔

۲۔ جہاں تک ممکن ہو ترجمہ میں قرآن مجید کے الفاظ کی پوری رعایت کرنی چاہیے۔ لیکن وَنَحْنُ عُصْبَةٌ کا ترجمہ "ہم جماعت کی جماعت ہیں" چاہے غلط نہ ہو لیکن جماعت کی تکرار بلاضرورت ضرور ہے۔ اسی طرح وَتَكُونُوا مِنْ بَعْدِهٖ قَوْمًا صَالِحِينَ کا ترجمہ "اور تمہارے سب کام بن جائیں گے" مراد ہے یہاں صالح کے بالکل لفظی ترجمہ (ٹھیک، بہتر) سے عدول کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔

۳۔ وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ کا یہ ترجمہ "اور وہ تم کو پہچانیں گے بھی نہیں" (ص۲۱) غلط ہے، یہ تو وَهُمْ لَا يَعْرِفُونَ کا ترجمہ ہے، آگے جہاں حضرت یوسفؑ کے پاس بھائیوں کے پہنچنے کا ذکر کرتے ہوئے یوسفؑ کے بھائیوں کو پہچان لینے اور بھائیوں کے یوسفؑ کو نہ پہچاننے کا ذکر ہے وہاں یہ الفاظ آئے ہیں فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهُ مُنْكِرُونَ اس سے معلوم ہوا کہ شعور اور معرفت میں بڑا فرق ہے۔

۴۔ إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّي کا یہ ترجمہ "بجز اس کے جس پر میرا رب رحم کرے" درست نہیں ہے بلکہ یہ تو إِلَّا مَنْ رَحِمَ رَبِّي کا ترجمہ ہوا۔ یہاں ما ظرفیہ ہے۔

۵۔ سوء و فحشا سے صغیرہ اور کبیرہ گناہوں کو مراد لینا (ص۲۷) صحیح نہیں ہے۔ سوء سے عام برائیاں مراد ہیں اور فحشا سے بے حیائی اور بدکاری مراد ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ خود فاضل مصنف نے اس کی تشریح میں برائی اور بے حیائی ہی لکھا ہے (ص۳۱)۔

۶۔ وَاسْتَبَقَا الْبَابَ کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں "حضرت یوسفؑ خود کو بچانے کے لیے اور زلیخا ان کو گھسیٹنے کے لیے (دروازے کی طرف دوڑے)، اسی میں پیراہن پھٹ گیا، مگر نصرت الٰہی نے مقفل دروازہ معجزانہ طور پر کھول دیا"۔ یہ وہی غیر قرآنی تفصیل ہے جس سے احتیاط کا مصنف نے دعویٰ کیا ہے، کیونکہ قرآن مجید نے وَغَلَّقَتِ الْأَبْوَابَ (دروازے بند کر دیے) کہا ہے، جب تغلیق کے معنی دروازہ مقفل کرنا نہیں ہیں تو مقفل دروازے کے معجزانہ طور پر کھلنے کا بھی سوال نہیں پیدا ہوتا۔

۷۔ دو ایک جگہ کتابت کی غلطیاں بھی ہیں۔

(الف) حَاشَ لِلّٰهِ کا ترجمہ حاشاء اللہ (ص۳۹) حاشا بھی غلط ہے اور للہ کو اللہ لکھنے کی غلطی بہت عام ہے۔

(ب) اجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَائِنِ الْأَرْضِ (ملکی خزانوں پر مجھکو معمور کر دیں) مامور معمور ہو گیا ہے۔

۸۔ ص۹۶، ۹۷، ۹۸ سادہ رہ گئے ہیں، اس کی وجہ سے آخری آیت کے بعض فوائد و نکات تحریر میں آنے سے رہ گئے۔

۹۔ مصنف نے آیتوں پر نمبر نہیں دیے ہیں اس سے استفادہ میں سہولت ہوتی ہے۔

"ض"

مطبوعات جدیدہ

ابو علی مسکویہ (انگریزی)

از جناب ڈاکٹر بدرالدین بٹ، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۱۵، قیمت ۲۰۰ روپیے، پتہ: اسلامک بک فاونڈیشن ۱۷۸۱، حوض سوئیوالان، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲۔

چوتھی اور پانچویں صدی ہجری کے مسلم ارباب کمال میں ابن مسکویہ مشہور مورخ، فلسفی اور ادیب تھے جن کو اخلاقیات میں ابن سینا کا ہم پایہ قرار دیا جاتا ہے، ان کی بعض تصنیفات تجارب الامم کتاب آداب العرب والفرس اور تہذیب الاخلاق وغیرہ زیادہ اہم اور بلند پایہ ہیں، زیر نظر کتاب لایق مولف کی ڈاکٹریٹ کا مقالہ ہے اسمیں ابن مسکویہ کے عہد، سوانح حیات، مطبوعہ و غیر مطبوعہ تصنیفات کا جامع تعارف کرایا گیا ہے اور ایک مورخ، صاحب طرز ادیب اور سماجی مصلح و مفکر کی حیثیت سے ان کی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے، عام طور پر اسے ابن مسکویہ کہا جاتا ہے۔ لیکن لایق مصنف کے نزدیک بوجوہ مسکویہ درست ہے، ان کی نظر میں وہ پہلا مسلم فلسفی ہے جس نے تاریخ کی تدوین میں واقعات کا فلسفیانہ نقطہ نظر سے جائزہ لیا ہے اور صرف کارآمد واقعات کا انتخاب کیا ہے، تجارب الامم کو تاریخ طبری کا خلاصہ سمجھا جاتا ہے لیکن مصنف نے متعدد روایتوں کی نشاندہی کر کے دکھایا ہے کہ وہ طبری کی تاریخ میں مذکور نہیں ہیں اور مسکویہ نے ان کو ماخذ کی صراحت کیے بغیر ہی نقل کر دیا ہے، انبیائے کرامؑ کے علوم و معارف سے کم اعتنائی کو مصنف نے ابن مسکویہ کی کمزوری

بتایا ہے اور اس کی بعض مثالیں بھی دی ہیں، وہ وطن پرستی میں بھی گرفتار تھا اس لیے ایرانی بادشاہوں کے اقوال بہت دلچسپی سے نقل کرتا ہے گو آل بویہ کی تاریخ کا وہ معتبر ماخذ ہے تاہم یہ بھی جانبدارانہ رنگ سے خالی نہیں ہے۔ یہ کتاب محنت و جستجو سے لکھی گئی ہے اس میں مسکویہ کی تصنیفات کے جو اقتباسات دیے گئے ہیں وہ مولف کے حسن ذوق کا ثبوت ہیں۔ اگر ان کے ترجمے بھی کر دیے جاتے تو فائدہ دوچند ہو جاتا۔

ایران میں جدید فارسی ادب کے پچاس سال (۱۹۰۰-۱۹۵۰)

از ڈاکٹر رضیہ اکبر، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ، کتابت و طباعت، صفحات ۳۷۵، قیمت ۲۲ روپیے، پتہ: حسامی بکڈپو، حیدرآباد، اے پی۔

ڈاکٹر رضیہ اکبر جامعہ عثمانیہ میں شعبۂ فارسی کی صدر رہ چکی ہیں، ایرانیات اور فارسی ادب پر ان کی بعض تحریریں بھی شایع ہوئی ہیں، زیر نظر کتاب میں انھوں نے اس صدی کے آغاز کے ایران کی سیاسی و معاشرتی زندگی کا جائزہ لینے کے بعد وہاں کی شاعری، ناول نگاری اور ڈراما نویسی وغیرہ پر مفصل بحث کی ہے، اپنے براہ راست مطالعہ کی بنیاد پر انھوں نے بعض مستشرقین اور خود ایرانی فضلا کی کئی باتوں سے اختلاف بھی کیا ہے مثلاً ایران کے ترقی پسند ادب کے ہر موڑ پر جدید ایرانی شاعروں اور دانشوروں نے قدیم علمی و ادبی سرمایہ سے اکتساب فیض کرتے ہوئے ماضی کی صحت مند روایتوں کی پاسداری کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بحیثیت مجموعی جدید فارسی ادب، قدیم ایرانی انداز فکر کا عکاس معلوم ہوتا ہے، کتاب میں اس صدی کے نصف اول کے نثر نگاروں اور شاعروں میں محمد علی جمال زادہ سے مرتضیٰ مشفق کاظمی اور نیما یوشیج سے گلچین گیلانی تک تقریباً تیس ادیبوں اور شاعروں کی خدمات

کا جائزہ لیا گیا ہے، کہیں کہیں نامانوس الفاظ اور ترکیبیں استعمال کی گئی ہیں مثلاً کروڑگیری، عقب ماندگی، پابجائی، اظہارات، ملوک الطوائفی، بہت چند، چند ایک اور اپنوں پرایوں کو گشش کرنے لگی وغیرہ حماس اور محاصر تاریخ شاید سہو کتابت ہے۔

اقوال سلف، حصہ سوم از مولانا محمد قمر الزماں، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ، کتابت اور طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۴۸، قیمت ۵۵ روپیے، پتہ: مکتبہ عزیزیہ ۲۴۸۔ بخشی بازار الہ آباد۔

علماء و صلحائے امت کے حالات و واقعات کی لڑی میں انکے اقوال و ملفوظات کے موتیوں اور جواہر پاروں کو پرونے کی روایت قدیم تذکروں سے چلی آتی ہے، انکے مطالعہ سے گویا ان بزرگوں کی مجلس و صحبت میں شرکت کی سعادت اور حضوری کے نور و سرور کی دولت ہاتھ آتی ہے، فاضل مرتب نے متعدد تذکروں میں بکھرے ہوئے ان موتیوں کو جمع کرنے کی کوشش کی جو اقوال سلف کے نام سے دو جلدوں میں شایع ہو کر اہل ذوق و اصحاب دل کی نظر میں قابل قدر و مستحسن قرار پائی، زیر نظر کتاب اسی سلسلہ کی ایک اور کڑی ہے۔ جس میں خاص طور پر بزرگان ہند میں حضرت خواجہ باقی باللہ نقشبندی سے حضرت شاہ میانجیو نور محمد جھنجھانوی تک تقریباً پچپن بزرگوں کے اقوال کو نہایت سلیقہ سے جمع کیا گیا ہے، علماء و مشائخ کے علاوہ ان میں جہانگیر و شاہجہاں، عالمگیر و ٹیپو سلطان شہید بھی شامل ہیں، اکثر بزرگوں کے اقوال کے ساتھ ان کے احوال بھی دیے گئے ہیں، بعض مقامات پر ضروری حواشی بھی ہیں، موضوع کی جاذبیت و تاثیر پر مولف کا موثر و دلنشین انداز بیان مستزاد ہے، شروع میں نواب صدیق حسن خاں کی ایک منتخب تحریر کا ترجمہ بھی ہے جو اہل کمال کے علوئے مرتبت و جلالت قدر کے متعلق ہے۔

(ع۔ ص)